غالب اور غالبیات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ستارہ امتیاز)

BEACON BOOKS

غالب اور غالبیات

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

(ستارۂ امتیاز)

بیکن بُکس
• قذافی مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور فون: 7351662 - 042
• گلگشت، ملتان فون: 6520791 ,6520790- 061
BEACON BOOKS
E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com
E-mail:beacon_books_pakistan@yahoo.com

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ بیکن بکس/مصنف سے با قاعدہ تحریری اجازت
لئے بغیر کہیں بھی شائع نہ کیا جائے۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورت حال
پیدا ہوتی ہے تو پبلشر/مصنف کو قانونی کارروائی کا حق حاصل ہوگا۔

اشاعت : 2005ء

عبدالجبار نے
لٹل سٹار پرنٹنگ پریس سے
چھپوا کر بیکن بکس ملتان-لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : -/125 روپے

ISBN 969 - 534 - 058 - X

انتساب

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے نام جن کی محبت ارزانیاں مجھے بشّاش و توانا رکھتی ہیں اور جن کی علمی و ادبی سرگرمیاں، ہم عصر جامعات کے لئے قابلِ رشک بن گئی ہیں۔

فرمان فتح پوری

فہرست مضامین

۱۔ کتاب سے پہلے (دیباچہ)

۲۔ غالب سے متعلق اداریٔ شذرات:

☆ دگر دانائے راز آید کہ ناید ۱

☆ دیوانِ غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں ۸

☆ غالب کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۳

☆ سوویت یونین میں غالب کی مقبولیت ۱۶

☆ غالب کی فارسی شاعری اور سید حامد ۱۷

☆ غالب اور تصوف ۲۳

☆ کچھ غالب کے بارے میں ۲۵

☆ بحوالۂ غالبیات ۲۶

۳۔ غالب سے متعلق کتابوں پر تبصرے:

☆ احوال و نقدِ غالب ۲۷

☆ روح المطالب فی شرح دیوانِ غالب ۲۸

☆ نذرِ غالب ۲۹

☆ فلسفۂ کلامِ غالب ۳۰

☆ غالب ڈائری ۳۱

☆ غالب اور مطالعۂ غالب ۳۳

☆ ہنگامۂ دل آشوب ۳۴

☆ صحیفہ سہ ماہی غالب نمبر ۳۵

☆ محاسنِ کلامِ غالب ۳۵

☆ غالب کون؟ ۳۷

☆ ''نقوش'' غالب نمبر ۳۷

☆ ''ادبِ لطیف'' غالب نمبر ۳۸

☆ دیوانِ غالب نسخۂ حمیدیہ ۴۰

☆ غالب اور انقلاب ستاون ۴۱
☆ حیاتِ غالب کا ایک باب ۴۲
☆ اشاریۂ غالب ۴۲

۴۔ غالب سے متعلق مصنفین کا تعارف:
☆ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی ۴۴
☆ دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۵۳
☆ نخچے بیادِ غالب ۵۹
☆ دام آگہی: مغرب میں غالب شناسی کی تازہ مثال ۷۲

۵۔ غالب سے متعلق اپنی کتابوں کے دیباچے:
☆ غالب: شاعر امروز و فردا ۷۹
☆ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب ۸۶
☆ شرح و متن غزلیات غالب ۹۶
☆ تعبیراتِ غالب ۱۰۵

۶۔ غالب سے متعلق مضامین جو میری کسی کتاب میں شامل نہیں:
☆ غالب اور محاسنِ کلام غالب ۱۰۷
☆ آسی کی شرح دیوانِ غالب ۱۱۳
☆ نقش ہائے رنگ رنگ ۱۲۳
☆ غالب کی اردو رباعیاں ۱۲۸
☆ غالب اور ڈاکٹر الیس کے نیازی

۷۔ غالب سے متعلق میری اپنی تحریروں پر چند ناقدین کے تاثرات:
☆ غالب شاعر امروز و فردا...... سید وقار عظیم ۱۳۲
☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناس...... ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ۱۳۶
☆ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی کے چند پہلو...... ڈاکٹر اسلم انصاری ۱۴۱
☆ بسلسلۂ غالب، ڈاکٹر فرمان کے غیر مرتب مقالات و تعارفات...... سیدہ افصح وحید ۱۵۲

۸۔ غالبیات فرمان فتح پوری کا اشاریہ...... عاصمہ وقار ۱۷۵
(۱۹۵۲ء تا ۱۹۹۸ء)

کتاب سے پہلے

اُردو شعرا میں غالب میرا محبوب ترین ''شاعر'' ہے۔ مطالعۂ غالب کا شوق ساتویں آٹھویں جماعت سے اوائل عمری میں پیدا ہوا، روز بروز بڑھتا گیا، غالب اور کلامِ غالب کے بارے میں سوچنے اور لکھنے پڑھنے کا وسیلہ بنا، اوّلین تحقیقی وتنقیدی مضامین کا عنوان بھی غالب ہی رہے اور سب سے زیادہ میں نے جس شاعر کے بارے میں لکھایا جس شاعر نے اپنے بارے میں مجھ سے سب سے زیادہ لکھوایا وہ بھی اسد اللہ خان غالبؔ تھے چنانچہ بحمد اللہ، اُن کے بارے میں اب تک میری مندرجہ ذیل چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

(۱) ''غالبؔ: شاعر امروز و فردا'' مطبوعہ اظہار سنز، لاہور ۱۹۷۰ء، طبع اوّل

(۲) ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالبؔ'' مطبوعہ حلقہ نیاز و نگار، کراچی ۱۹۹۵ء، طبع اوّل

(۳) ''شرح و متن غزلیاتِ غالبؔ'' مطبوعہ بیکن بکس گل گشت بوسن روڈ ملتان ۲۰۰۰ء، طبع اوّل

(۴) ''تعبیراتِ غالب'' مطبوعہ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی ۲۰۰۲ء، طبع اوّل

ان کتابوں نے مجھے غالب کے رشتے سے، زبان وادب کے قارئین سے متعارف کرایا، توقیر بخشی، تحقیق وتنقید کے باب میں سرخرو کیا اور لکھنے پڑھنے پر اس طرح مستعد و آمادہ رکھا کہ غالب کے ساتھ ساتھ میں نے موضوعات واصناف کے حوالے سے تقریباً زبان وادب کی جملہ اہم شاخوں کو اپنے مطالعے کا محور بنا لیا۔ اُردو رُباعی، اُردو مثنویات، اُردو کی منظوم داستانیں، اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری اور اردو افسانہ غرضیکہ سب پر اپنی بساط بھر تحقیقی وتنقیدی کام کیا اور ان کے موضوعات ومسائل پر اُردو کو پوری پوری کتابیں دے دیں لیکن ان موضوعات سے لگاؤ یا غالب کا مسلسل مطالعہ، نہ تو میرے ذوقِ تحقیق وتنقید کو یک رُخا کرا سکا اور نہ مجھ سے اُردو کے دوسرے بڑے شعرا کو جی بھر پڑھنے اور اُن پر سوچنے اور لکھنے کا حق چھین سکا، چنانچہ مجھے یہ محسوس کر کے طمانیت ہوتی ہے کہ میں نے صرف غالب کے بارے میں نہیں بلکہ میر تقی میرؔ، میر ببر علی انیسؔ اور علامہ اقبال جیسے بڑے شاعروں کے بارے میں بھی اپنے مطالعات کو جامع صورت میں پیش

کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں

۱- اقبال سب کے لئے

۲- میر انیس: حیات اور شاعری

۳- میر تقی میر کو سمجھنے کے لئے

کے عنوانات سے میری تحقیقی و تنقیدی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ایسی مقبول ہوئیں کہ ان کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے لیکن، یہ سب چھپ چکنے کے بعد بھی نہ تو غالب نے میرا پیچھا چھوڑا اور نہ میں اُن سے اپنا پیچھا چھڑا سکا چنانچہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے، وہ غالب کے بارے میں میری پانچویں کتاب ہے۔ اس کا عنوان ہے ''غالب اور غالبیات''

اس کتاب میں کیا ہے اس کا اندازہ قارئین کو فہرست مضامین سے ہو جائے گا، البتہ اس سوال کا جواب کہ اس کتاب میں جو کچھ ہے وہ کیسا ہے، مجھے نہیں آپ کو دینا ہے۔ میری اس کمزوری کا تو آپ میں سے بیشتر کو علم ہے کہ اُردو شعرا میں مجھے غالب، سب سے زیادہ عزیز ہے اور اُس کے فکر وفن کے بارے میں میری رائے مختصراً شروع سے یہی رہی ہے کہ

بلائے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

ایسے میں ''غالب اور غالبیات'' کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اس کتاب کی حیثیت، کلامِ غالب کی دل رُبائی و رعنائی کے تعلق سے زردے کی دیگ کی کھرچن جیسی ہے اور جو لوگ اس کھرچن کی حلاوت و ذائقہ کے لذت آشنا ہیں، وہ اس کی داد ضرور دیں گے۔

آخر میں مجھے شکریہ ادا کرنا ہے شعبہ اُردو کے استاد جناب محمد ساجد خان صاحب کا اور ہیلن بکس کے جناب عبد الجبار صاحب کا، جن کے لطفِ خاص سے یہ کتاب اتنی جلد منظرِ عام پر آگئی۔ کتاب کے نام کا جواز آپ کو کتاب کے مطالعے سے خود بخود مل جائے گا کہ اس میں صرف غالب و کلامِ غالب ہی نہیں بلکہ اُن سے متعلق تصانیف و مصنفین بھی زیرِ بحث آگئے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالبؔ کے بارے میں ادارتی شذرات

دگر دانائے راز آید کہ ناید

ابھی غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کا سلسلہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اقبالؔ کی برسی کی تقریبیں شروع ہوگئیں۔ مانا کہ یہ امر اتفاقی ہے لیکن ان دونوں میں ایک معنوی رشتہ بھی ہے۔ اس رشتے کے سبب اردو میں جب کبھی عظیم شاعری کے سلسلے میں غالبؔ کا ذکر کیا جائے گا اقبالؔ بہرطور زیر بحث آئیں گے اور جب اقبالؔ کی حکیمانہ شاعری کا تذکرہ ہوگا تو غالبؔ خود بخود ذہن میں اُبھر آئیں گے۔ بات یہ ہے کہ عہد و ماحول کے اختلاف کے باوجود غالبؔ اور اقبالؔ ایک دوسرے سے بہت گہری باطنی مناسبت رکھتے ہیں، ان کے فکر و فن میں عجیب و غریب قسم کی معنوی مماثلت ہے۔ صرف یہی نہیں کہ دونوں، اردو فارسی کے خلاق و عظیم اور مفکر و صاحب طرز شاعر ہیں بلکہ زندگی و کائنات اور فکر و فن کے بارے میں اُن کے خیالات و نظریات باہم اتنے ملتے جلتے ہیں کہ بُعد زمانی کے باوجود وہ ایک دوسرے سے بہت قریب نظر آتے ہیں، چند اشعار دیکھئے:

غالبؔ:

حسن فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اقبالؔ:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

غالبؔ:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبالؔ:

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

غالبؔ:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں ابتک
رہنے دے ابھی یاں کہ مجھے کام بہت ہے

اقبالؔ:

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

غالبؔ:

ہم مُوحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

اقبالؔ:

بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گُم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ تورانی نہ افغانی

غالبؔ:

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

اقبالؔ:

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بُلبُل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فُغاں تک ہے

غالبؔ:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش کے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اقبالؔ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

غالبؔ:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اقبالؔ:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکُشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

غالبؔ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اقبالؔ:

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

غالبؔ:

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اقبالؔ:

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

غالبؔ:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اقبالؔ:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

غالبؔ:

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مُردن و آوخ مسلماں زیستن

اقبالؔ:

طلسم بے خبری، کافری و دینداری
حدیثِ شیخ و برہمن فسون و افسانہ

غالبؔ:

قطرہ میں دریا دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اقبالؔ:

جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
درد بے پایاں ہے درد لا دوا رکھتا ہوں

غالبؔ:

جلوہ و نظارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ

اقبالؔ:

صورت گرِ کہ پیکرِ روز و شب آفرید
از نقشِ این و آں بہ تماشائے خود رسید

غالبؔ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اقبالؔ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

غالبؔ:

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اقبالؔ:

عشق از فریادِ ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزمِ خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

غالبؔ:

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

اقبالؔ:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

غالبؔ:

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

اقبالؔ:

برمقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

غالبؔ:

جنّت نہ کند چارۂ افسردگیِ ما
تعمیر بہ اندازۂ ویرانیِ ما نیست

اقبالؔ:

دلِ عاشقاں بہ میرد بہ بہشتِ جاودانے
نہ نوائے درد منداں نہ غمے نہ غم گسارے

غالبؔ:

کارے عجب افتاد بایں شیفتہ مارا
مومن نہ بود غالب و کافر نہ تواں گفت

اقبالؔ:

اقبالؔ غزل خواں را کافر نہ تواں گفتن
سودا بہ دماغش زد از مدرسہ بیروں بہ

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں اشعار ہیں جن میں غالبؔ اور اقبالؔ کے فکر و فن کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ غالبؔ کے بعد ایک دو نہیں اُردو میں متعدد ایسے شاعر سامنے ہیں جن کی بڑائی مسلّم ہے۔ حالیؔ، حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جوشؔ، فراقؔ، یگانہؔ، عزیزؔ و اثرؔ اور شادؔ و جلالؔ سب قابلِ احترام ہیں لیکن اُردو کے جن شاعروں نے فکر و فن کی بلند ترین و عظیم ترین چوٹیوں کو چھولیا ہے اور جن کا نام دنیا کے چند گنے چنے مشاہیرِ فن کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ان میں غالبؔ کے بعد صرف اقبالؔ کا نام آتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری صاف ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے غالبؔ کے اس چیلنج کا جواب بن جانے کی کوشش کی ہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا، میرے بعد

لیکن آج کل کے بالشتیے اور پست ذہن ادیبوں یا شاعروں کی طرح اقبال اپنے بزرگوں کی رہنمائی کے منکر نہیں ہیں بلکہ ان کا رویہ اپنے پیش رو شعرا کے ساتھ وہی ہے جو کسی خورد کا اپنے بزرگ کے سامنے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اقبالؔ نے ایک دو جگہ نہیں کئی جگہ اجمال سے نہیں خاصی تفصیل سے، تنگ نظری سے نہیں بڑی فراغ دلی سے غالبؔ کے کمالِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس

اعتراف سے اقبالؔ سبک سر نہیں ہوئے بلکہ ان کی عظمت اور بڑھ گئی ہے۔

یہ دراصل اُردو کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی انیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر کی آنکھ بند ہوئی، بیسویں صدی کا عظیم ترین شاعر اقبالؔ پیدا ہو گیا۔ کاش بیسویں صدی کے آخر میں اکیسویں صدی کا عظیم شاعر نمودار ہو جائے اور اقبالؔ کے آخری ایام کے ان اشعار:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمدِ روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

کا جواب بن کر علامہ اقبال کی روح کی تسکین کا ذریعہ بن جائے۔

دیوانِ غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں

پچھلے ڈیڑھ سو سال میں عیار الشعراء اور عمدۂ منتخبہ سے لے کر نکارے زیرِ نظر غالب نمبر، تک مرزا نوشہ کے متعلق جس تفصیل و اہتمام سے لکھا گیا ہے، اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب، شاعر، نقاد یا مورخ ہو جس نے غالبؔ کے بارے میں اظہارِ خیال نہ کیا ہو، لیکن ان کے متعلق جو شہرت و مقبولیت ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی رائے کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے نقاد کی رائے کو میسر نہ آئی، ڈاکٹر بجنوری کے لفظوں میں:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب، لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔۔''

اس رائے کو بعض ناقدین نے مبالغہ آرائی سے تعبیر کیا اور بعض نے ''تاثراتی تنقید'' کہہ کر اس کی اہمیت کم کرنی چاہی لیکن ڈاکٹر بجنوری کی رائے غالبؔ کے اس شعر کے مصداق ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چوں کہ ہمارے آپ کے دل کی آواز اور ہمارے ذوقِ تحسین و تنقید کی تسکین کا ذریعہ تھی اس لئے بہت جلد زباں زدِ خلائق ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالیؔ کے بعد، غالبؔ کے سلسلے میں ڈاکٹر بجنوری کے انھیں فقروں نے ہمیں ایک بار پھر چونکایا ہے۔ اُن کی بڑائی کا تازہ احساس دلایا ہے اور ان کے رتبۂ شاعری کو پہچاننے اور پہچنوانے پر از سرِ نو آمادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری کے بعد سے اب تک غالبؔ کے بارے میں کتنا کچھ لکھا گیا ہے، اس کی صحیح

مقدار تو غالبؔ کے اشاریہ نگار ہی بتا سکتے ہیں لیکن اتنی بات تو ادب کا ہر قاری وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس عرصہ میں بلند پایہ تحقیق وتنقید کا کام جس انہماک، ذوق وشوق سے غالبؔ پر ہوا ہے کسی اور شاعر پر نہیں ہوا اور آج غالبؔ کے "جشنِ صد سالہ" کے موقع پر ان کے متعلق جو سیکڑوں تازہ کتابیں اور رسائل کے خصوصی شمارے شائع ہو رہے ہیں، یہ اسی انہماک و ذوق وشوق کا واضح ثبوت ہے۔

اس موقع پر بعض وجوہ سے میرا ارادہ نگار کے غالبؔ نمبر نکالنے کا نہ تھا، اوّل اس لئے کہ غالب کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کے متعلق تازہ اور کار آمد مضامین کا فراہم کرنا آسان نہ تھا۔ دوسرے اس لئے کہ نگار اپنی اڑتالیس سالہ زندگی میں اس سے پہلے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۶۱ء میں مختلف نوعیت کے دو غالب نمبر پہلے ہی شائع کر چکا ہے اور آج جب کہ اکثر ادبی رسائل غالب نمبر شائع کر رہے ہیں۔ نگار کو اس انبوہ میں شامل ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے یہ خیال کیا کہ خود غالبؔ سے اس بارے میں مشورہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ لوگ عام طور پر کسی کام کے آغاز کے لئے حافظ کے دیوان سے فال نکالتے ہیں، میں یہ کام غالب کے اُردو دیوان سے لیتا ہوں چنانچہ میں نے ان کا اُردو دیوان کھولا اور آنکھ بند کر کے انگلی رکھی یہ شعر سامنے آیا کہ۔

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

گویا اس شعر کے ذریعے مجھے غالبؔ نمبر نکالنے کی ممانعت کر دی گئی اور میں نے اس خیال ہی کو ترک کر دیا۔ کچھ دنوں بعد نگار کے قارئین اور قلمی معاونین کے خطوط آنے شروع ہوئے، کسی نے پوچھا:

"کیا نگار کا غالب نمبر شائع ہو رہا ہے؟"

اور کسی نے سوال کیا کہ:

"نگار کا غالبؔ نمبر کب تک نکل رہا ہے؟"

میں نے ان سوالوں کے جواب میں خاموشی اختیار کی تو بعض حضرات نے یہ سوال اٹھایا کہ

"غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر 'نگار' غالبؔ نمبر کیوں شائع نہیں کر رہا۔"

سوال کرنے والے ایک دو نہیں سیکڑوں تھے، اس لئے میں بھی اس مسئلے پر از سر نو غور کرنے پر مجبور ہوا اور غالبؔ کا دیوان دوبارہ اٹھایا۔ اب کے یہ شعر سامنے آیا۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں، ہم سفر ملے

اس طرح ''غالب نمبر'' سے باز رہنے کی ایک بار پھر مجھے غالبؔ کی طرف سے ہدایت مل گئی لیکن میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا ''آپ کی انگلی پوری طرح اس شعر پر نہیں تھی بلکہ دو شعروں کے بیچ میں تھی۔ اس لئے آپ آنکھ بند کیجئے اور دیوان کھول کر دوبارہ انگلی رکھئے، میں نے یہ بھی کیا، اس بار انگلی کے نیچے یہ شعر تھا۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

اس کے بعد ''غالب نمبر'' کا خیال ترک کر دینے کے سوا، میرے لئے کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اطمینان سے بیٹھ گیا، وقت گزرتا گیا، حتیٰ کہ دسمبر ۶۸ء شروع ہو گیا، جشن صد سالہ کی تاریخ بہت قریب آ گئی اور اب غالبیات کے مختلف اداروں اور انجمنوں نے یہ پوچھنا شروع کیا کہ:

''غالبؔ کے جشن صد سالہ کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟''
''نگار نے کیا پروگرام بنایا ہے؟''
''کیا اس پروگرام کی تفصیل آپ ہمیں بھیج سکتے ہیں؟''

میں نے ان سوالوں کے جواب میں لکھا کہ نگار کے پاس اس سلسلے میں نہ تو کوئی پروگرام ہے اور نہ وہ اس موقع پر کوئی چیز شائع کرے گا، اس کے جواب میں بعض ادیبوں اور مخلص دوستوں نے مجھے اس طور پر سمجھانا شروع کیا کہ:

''ہندوستان میں ''غالب صدی'' سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ہر سطح پر خاصے دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ پاکستان میں البتہ حکومت اس کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی، اس لئے نجی اداروں ہی کو اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے اور کچھ نہیں تو اس موقع پر ہر ادبی رسالہ ایک ''غالب نمبر'' تو شائع ہی کر سکتا ہے خصوصاً نگار کا اس سلسلے میں خاموش رہنا اس کی علمی و ادبی روایات کے منافی ہے، نیاز صاحب ہوتے تو ضرور اس موقع پر کچھ کرتے۔''

آخری جملے نے میرے لئے تازیانہ کا کام کیا، میں چونک پڑا اور وقت کی کمی کے باوجود ایک بار پھر غالبؔ نمبر کے سوچ میں پڑ گیا، دیوان غالبؔ لایا، آنکھیں بند کیں اور دیوان کھول کر انگلی رکھی، یہ شعر سامنے تھا کہ۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

گویا بالکل آخری میں مجھے غالبؔ نمبر نکالنے کا حکم ملا، سخت الجھن ہوئی، سوچنے لگا کہ ایک مہینے میں یہ کام کیسے ہوگا، مضامین کہاں سے آئیں گے کب لکھے جائیں گے؟ اور پرچہ کب چھپے گا اور اگر کسی طرح چھپ بھی گیا تو اس میں خاص بات کیا ہوگی؟ اسی اُلجھن میں آنکھ بند کر کے غالبؔ کے دیوان پر ایک بار پھر انگلی رکھی، شعر تھا۔

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے

گویا اس شعر کے ذریعہ مجھے غالبؔ نے یہ سمجھا کر تسلی دی کہ نگار کا غالب نمبر جیسا کچھ بھی ہوگا، دوسرے پرچوں کے خصوصی شماروں سے الگ ہونے کے سبب قاری کی توجہ کا سبب بہر حال بنے گا، اس لئے اس خیال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن اصل سوال پھر بھی باقی رہا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مضامین اچھے یا بُرے لائے کہاں سے جائیں؟ اللہ کا نام لے کر ایک بار پھر دیوان غالبؔ کھولا۔ اب کے اس شعر پر انگلی تھی۔

غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
باوجود دلجمعی، خوابِ گُل پریشاں ہے

عجیب وغریب شعر سامنے آیا۔ مفہوم ہی آسانی سے سمجھ میں نہ آیا تعبیر کیا بنتی، بڑے غور وخوض کے بعد محسوس ہوا کہ جیسے، دوسرے مصرعے کے پردے میں مجھے غالبؔ یہ سمجھا رہے ہیں کہ:

''تیرے پاس تو غالبؔ نمبر کا بڑا قیمتی ساز وسامان موجود ہے تو اس سلسلے میں بے وجہ پریشان ہے۔۔''

میں نے اس ساز وسامان پر غور کرنا شروع کیا تو نگار کی اڑتالیس سالہ ادبی تاریخ اچانک میرے سامنے آ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ غالبؔ کی زندگی اور فن کے متعلق سینکڑوں اعلیٰ درجے کے مضامین جو نگار کے اکثر قارئین کی نظر سے ہنوز پوشیدہ ہیں، نگار کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں اور اگر

میں چاہوں تو ان کا انتخاب بڑی آسانی سے ''غالب نمبر'' کے نام سے پیش کر سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہی کیا، سارے مضامین کو یکجا کرنا تو مناسب ہی نہ تھا، اوّل اس لئے کہ ایک مہینے کی قلیل مدّت میں ان کی کتابت و طباعت ممکن نہ تھی۔ دوسرے اس لئے کہ نگار کے بہت سے مضامین بعض دوسرے رسائل مثلاً افکار کراچی کے ''غالب نمبر'' میں پہلے ہی شامل کئے جا چکے تھے، اس لئے اس مختصر عرصے میں جتنے مضامین آسانی سے لکھوائے جا سکتے تھے منتخب کر لئے۔ لیکن اس احتیاط و التزام کے ساتھ کہ غالبؔ کی زندگی اور فن کے سارے اہم پہلو ایک مستند صحیفے کی صورت میں اس کے اندر سمٹ آئیں، معلوم نہیں یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی لیکن کم از کم اس سے یہ تو ہوا کہ مجھے جشن صد سالہ کے موقع پر روح غالبؔ کے سامنے سرخرو ہونے اور قارئین نگار و پرستارانِ غالبؔ کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔

غالبؔ کے خطوط مرتبہ خلیق انجم

یہ شمارہ غالبؔ کی یاد میں اور غالبؔ کے خطوط سے متعلق ہے۔ ایک ایسے ادیب کے مرتبہ خطوطِ غالب سے متعلق ہے جسے غالبیات کے باب میں معتبر و مستند مقام حاصل ہے۔ میری مراد ڈاکٹر خلیق انجمؔ سے ہے۔

غالبؔ، اردو کے صرف عظیم شاعر ہی نہیں عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ اُن کی نثر اگرچہ خطوط کی صورت میں ہے اور خطوط نگاری کی تاریخ میں ان کے خطوط منفرد مقام رکھتے ہیں۔ غالبؔ کو اردو کی عام نثری تاریخ میں بھی بحیثیت صاحبِ طرز نثر نگار نہایت بلند و ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی نثر ہماری تہذیب، تاریخ، معاشرت، علمی و ادبی روایت اور ثقافتی نادرہ کاریوں کا آئینہ اور فنی لطافتوں کے حامل معیار و اسلوب کا لازوال پیمانہ ہے۔۔۔ شاید اسی لئے ان کی نثر اُردو کے سارے نامور محققوں اور نقادوں کے لئے جاذبِ نظر ٹھہری ہے اور ہر ایک نے بساط بھر اس کی داد دی ہے۔ غالبؔ کے خطوط دو چار بار نہیں سیکڑوں بار مختلف اداروں سے شائع ہو چکے ہیں اور ایک دو نہیں درجنوں بڑے ادیبوں نے ان کی ترتیب و تدوین میں دلچسپی لی ہے۔ چنانچہ اُن کے خطوط کے منتخبات و مُرتبات کے حوالے سے یوں تو متعدد نام لئے جا سکتے ہیں لیکن مرزا محمد عسکری، مولانا امتیاز علی عرشی، منشی مہیش پرشاد، آفاق حسین آفاق، مولانا غلام رسول مہر اور ڈاکٹر خلیق انجم خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم، ترقی اردو ہند کے سکریٹری جنرل ہیں اور متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ تحقیق و تنقید دونوں میں اُن کے قلم کو رتبۂ اعتبار حاصل ہے اور ان کی ہر تحریر اور کتاب، علمی و ادبی حلقوں میں انتہائی وقعت و قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا شمار اردو کے اُن

ممتاز محققوں میں ہوتا ہے، جن کی ذہنی تربیت میں پروفیسر محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کے تحقیقی کارناموں نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اب تک اُن کی پندرہ سولہ تصنیفات اور تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں جب ''مرزا محمد رفیع سودا'' شائع ہوئی تو پروفیسر آلِ احمد سرور نے اُس علمی اور تحقیقی کارنامے کی داد دیتے ہوئے لکھا ''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابلِ قدر تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔''

خلیق انجم صاحب کو ابتدا ہی سے دو موضوعات سے خاص دلچسپی رہی ہے ایک غالبیات دوسرے ترتیبِ متن کے مسائل، غالب سے متعلق اُن کی دو کتابیں ''غالب کی نادر تحریریں'' ۱۹۶۱ء میں اور ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئیں۔ ترتیبِ متن کے مسائل پر بھی اردو میں پہلی کتاب ''متنی تنقید'' انھیں کی توجہ سے منظر عام پر آئی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے برسوں کی محنت سے ''غالب کے اُردو خطوط'' کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا ہے۔ یہ وہ کام ہے، جس میں غالبیات اور متنی تنقید سے متعلق ان کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔

زیرِ نظر تنقیدی ایڈیشن میں غالبؔ کے خطوط کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ خطوطِ غالبؔ کے پہلے اڈیشنوں اور غالبؔ کے تقریباً پونے دو سو اصل خطوط یا ان کے عکسوں کو، بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہر خط کے متن کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اہم مجموعوں کے متن کے اختلافات نسخ پیش کئے گئے ہیں، غالبؔ کے تقریباً پونے دو سو خطوط کے عکس شامل کئے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کے مختصر سوانح لکھے گئے ہیں۔ بیشتر مکتوب الیہم کی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں جن واقعات، افراد، مقامات، کتب اور رسائل وغیرہ کا ذکر کیا ہے، ان پر بڑی محنت، جستجو اور دیدہ ریزی سے تفصیلی حواشی لکھے گئے ہیں۔ تمام خطوط کے مکمل اور جامع اشاریے تیار کئے گئے ہیں۔ یہ حواشی اور اشاریے چوتھی جلد میں شامل ہیں۔ غالبؔ انسٹی ٹیوٹ دہلی نے چار جلدوں میں سائنٹی فک انداز میں تیار کئے ہوئے غالبؔ کے خطوط کے اس تنقیدی ایڈیشن کو خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر انجم کی مرتبہ خطوطِ غالبؔ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ چوتھی زیرِ طباعت ہے۔ ان مجلدات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:-

۱- مکتوب الیہم کی تصویریں۔

۲- مکتوب الیہم کے تفصیلی حالات۔

۳- ان تمام واقعات، افراد، مقامات، کتب اور رسائل پر جامع حواشی جن کا غالبؔ نے اپنے خطوط میں ذکر کیا ہے۔

۴- ان تمام فارسی اور اردو اشعار کا اشاریہ، جنھیں غالبؔ نے اپنے اردو خطوط میں نقل کیا ہے۔

۵- تمام افراد، مقامات اور کتب و رسائل کا مکمل اشاریہ۔

مطبوعہ تین جلدوں میں غالبؔ کے خطوط، متن کے مآخذ اور حواشی کے ساتھ اختلافاتِ نسخ بھی دیے گئے ہیں۔

جلد اوّل کا تحقیقی و تنقیدی مقدمہ سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ گویا ''خطوطِ غالب'' پر ایک مکمل کتاب ہے۔ یہ مقدمہ کتنا گراں بہا ہے اور اپنے اندر کیا کچھ رکھتا ہے، اس کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہے۔ البتہ اس جگہ جلد اوّل کے مقدمے کا صرف ایک جزو جس کا تعلق خطوطِ غالبؔ کے مختلف ایڈیشن، املا کی خصوصیت اور بعض الفاظ کے استعمال سے ہے۔ نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ خطوطِ غالبؔ کی ترتیب و تدوین کا یہ کام، جسے ڈاکٹر خلیق انجم نے پانچ پانچ سو صفحات کی چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا ہے، کس نوعیت و معیار کا ہے اور غالبؔ کو سمجھنے اور سمجھانے میں وہ کیسا اہم کردار ادا کرتا ہے۔

پوری اردو دنیا کی طرف سے ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کے کام کے ناشر ''غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب، دہلی'' شکریے اور خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ اُن کے ہاتھوں ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام پایا جو خطوطِ غالبؔ کے سلسلے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(نگار، فروری ۱۹۸۸ء)

سوویت یونین میں غالبؔ کی مقبولیت

۱۹۶۹ء میں غالب کی ولادت کا جشنِ صد سالہ منایا گیا تو اس میں دنیا کے متعدد ملکوں نے حصہ لیا۔ کہیں مذاکروں کا اہتمام کیا گیا کہیں مشاعروں کا۔ کہیں تقریروں کے لیے بلند پایہ جلسے منعقد ہوئے اور کہیں تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کُتب ورسائل شائع کیے گئے۔

''سوویت جائزہ'' نامی رسالے نے بھی تیسری جلد کے دسویں شمارے یعنی فروری ۱۹۶۹ء کے پرچے کو غالب کے لیے مخصوص کیا۔ یہ رسالہ شعبۂ اطلاعات سفارت خانۂ سوویت یونین دہلی سے شائع ہوا۔ اس شمارے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے سارے مقالات، روسی ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں اور غالبؔ کی مقبولیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

رسالہ مذکور چوں کہ نایاب وکمیاب ہے اور اس کا نسخہ میرے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے اس لیے نذرِ قارئین کیا جاتا ہے۔ یقین ہے کہ غالب شناسوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

(نگار، ستمبر ۱۹۸۶ء)

غالبؔ کی فارسی شاعری اور سیّد حامد

جاننے والے جانتے ہیں کہ غالب کی فارسی شاعری، ان کی اردو شاعری سے کم تر درجے کی نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کی مقبولیت وشہرت کا مدار فارسی پر نہیں اردو پر ہے۔ یہی صورت کم وبیش علامہ اقبال کی ہے۔ میرے نزدیک اقبال کی فارسی شاعری بحیثیت مجموعی، اردو شاعری سے زیادہ توانا وپُر کار ہے۔ لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال میں فارسی اور ذوق فارسی پر ایسا زوال آیا کہ غالب واقبال کی فارسی شاعری کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی وہ مستحق تھی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ فارسی زبان سے آشنائی اور فارسی ادب سے لطف اندوزی کے لیے شعوری طور پر کچھ نہ کچھ کیا جائے اور ایسے دل نشیں اسلوب میں کیا جائے جو، ادب کے قاری کو فارسی زبان وادب سے قریب تر لا سکے۔ میری مراد اس دلکش اُسلوب سے ہے جس کی مثال میں، ہم مولانا شبلی کی ''شعرالعجم''، مولانا آزاد کی ''آبِ حیات''، مولانا حالی کی ''یادگارِ غالب''، نیاز فتح پوری کی ''انتقادیات''، مسعود حسن رضوی کی ''ہماری شاعری'' اور مجنوں وفراق گورکھپوری کی تنقیدی تحریروں کو پیش کر سکتے ہیں۔

سائنسی، سماجی، نفسیاتی، ساختیاتی، بین العلومی اور بعض دوسرے نوع کی تنقید یقیناً بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تنقید کے ان دبستانوں نے اردو ادب کو فکر ونظر کا نہایت قابلِ قدر افق دیا ہے لیکن ادب پر فکر وفلسفہ اور علم وحکمت کا دباؤ کچھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ شعر وادب کی ترویج واشاعت تو دور کی بات ہے، اس کے بوجھ سے خود تنقید کی کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ پہلے کی بہ نسبت تعلیم عام ہونے کے باوصف ادب کے قارئین کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے، اس فضا میں مجھے سید حامد صاحب

کا مقالہ ''غالب کی فارسی غزل'' بہت کارآمد اور بھلا معلوم ہوا۔ انھوں نے اس کے ذریعے غالب کی غزلیہ شاعری کو نہایت خوبصورتی سے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وقت خسرو، بیدل، فیضی اور غالب وغیرہ کے تقابلی مطالعے یا ان کے شاعرانہ مرتبے کے تعیّن کا نہیں بلکہ ان کی شناخت کروانے اور نئی نسل کو ان کی طرف راغب کرانے کا ہے۔ سیّد حامد صاحب نے اس فریضے کو جس خوبی سے انجام دیا ہے وہ میرے زاویۂ نظر سے حد درجہ لائق ستائش ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کے آغاز میں بہت صحیح لکھا ہے کہ:

> ''مقصد غالب کی فارسی غزل کا اردو غزل سے مقابلہ کرنا نہیں، غالب کی فارسی غزلوں سے حظ اندوز ہونا اور اپنے حظ میں قارئین کو شریک کرنا ہے۔ شریک کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ فی زمانہ اردو جاننے والوں کی غالب اکثریت فارسی نہیں جانتی اس لیے جو اشعار منتخب کیے گئے ہیں ان کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔''

غالب کی فارسی شاعری کے سلسلے میں اس طرح کا صرف ایک مضمون اس سے پہلے لکھا گیا تھا۔ یہ علامہ نیاز فتح پوری کا تھا۔ امداد امام اثر کی غالب ناشناسی کے جواب میں تھا اور یہ نگار میں چھپا تھا۔ نیاز کے اس مقالے نے غالب کی فارسی شاعری کی طرف اہلِ ذوق کو رجوع کرنے میں وہی کردار ادا کیا تھا جو غالب کے اردو کلام کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری کے مقالے ''محاسنِ کلام غالب'' نے کیا تھا۔ بعد ازاں غالب کی فارسی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا۔ کتابی شکل میں بھی اور مقالات کی صورت میں بھی لیکن غیر دلکش پیرائے میں اس لیے بے اثر رہا۔ سیّد حامد صاحب کا مقالہ اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جن حضرات کی نظر سے سیّد صاحب کا مقالہ گزرے گا وہ اس سے لطف اندوز بھی ہوں گے، غالب کی فارسی غزل کا احساس بھی ان کے اندر جاگے گا اور ذوقِ فارسی کو نکھارنے میں بھی انہیں اس سے مدد ملے گی۔

بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ اس طرح کا کوئی تعارفی مضمون غالب اور بعض دوسروں کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھا جائے، اس سلسلے میں ممتاز غالب شناس اور غالب کے پرستار جناب آفتاب احمد خاں صاحب سے تبادلۂ خیال بھی ہوا لیکن عملاً کچھ نہ ہو سکا۔ سیّد حامد صاحب کا مقالہ سامنے آیا تو اسے پڑھ کی دلی مسرت ہوئی کہ کم از کم میرے لیے یہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' کے مصداق ہے۔ یہ بات مزید خوشی کا باعث ہے کہ سیّد صاحب کے

مقالے میں غالب کی ساری اہم غزلیں اور بہترین اشعار زیر بحث آ گئے ہیں اور انھوں نے بڑے خوبصورت نثر میں ان کی مختصر تشریح بھی کر دی ہے نیز ہم معنی اردو اشعار بھی جا بجا دے دیے ہیں۔ البتہ غالب کے بعض نہایت دلکش و مشہور اشعار سیّد صاحب کے مقالے میں جگہ نہیں پا سکے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہو گی کہ ایسا کرنے سے مقالہ مزید طویل ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار میرے حافظے میں کلبلا رہے ہیں۔ اس لیے اگر میں ان میں سے چند اس جگہ درج کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا:-

کارے عجب اُفتاد بایں شیفتہ مارا
کافر نہ بود غالب و مومن نہ تواں گفت

رمز بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد
محرم آست کہ رہ جز بہ اشارت نہ رود

جلوہ و نظّارہ پنداری کہ از یک گوہر است
خویش را در پردۂ خلقے تماشا کردہ

خوش بود فارغ ز بندِ کفر و ایماں زیستن
حیف کافر مُردن و آوخ مسلماں زیستن

شیوۂ رندانِ بے پروا خرام از من مپرس
ایں قدر دانم کہ دشوار است آساں زیستن

گُلت را نوا نرگست را تماشا
تو داری بہارے کہ عالم نہ دارد

ز من حذر نہ کُنی گر لباسِ دیں دارم
نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

جانِ غالب، تابِ گفتارے گماں داری ہنوز
سخت بیدردی کہ می پرسی، ز ما، احوالِ ما

جنوں مستم بہ فصلِ نو بہاراں می تواں گشتن
صراحی بر کف و گُل در کنارم می تواں گشتن

بے تکلّف درِ بلا بُودن بہ از بیمِ بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

بروں میا کہ ہم از منظرِ کنارۂ بام — نظارۂ ز درِ نیم باز می خواہم

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل — قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

جُز سخن کفرے و ایمانے کجا است — خود سخن در کفر و ایماں می رود

زلکنت می تپد نبضِ رگِ لعلِ گہر بارش — شہیدِ انتظارِ جلوۂ خویش است گفتارے

گر ذوقِ سخن بہ دہر آئین بودے — دیوانِ مرا، شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے — آن دین را ایزدی کتاب ایں بودے

گیرم بوقتِ ذبح سپیدن گناہِ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہِ کیست

یہ تو سیّد حامد صاحب کے مقالے کا تعارف تھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) کی تازہ کتاب ''غالب'' مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم میں شامل ہے اور جس کا عنوان ہے ''غالب کی فارسی غزل''۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود سیّد حامد صاحب کیا ہیں؟ میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس سوال کا قدرے تفصیل سے جواب دوں کہ میں سیّد صاحب کے کمالات سے کسی نہ کسی حد تک واقف، ملّی و قومی مسائل کے باب میں ان کی بصیرت کا قائل اور ان کے اندازِ فکر کا گھائل ہوں لیکن افسوس کہ نگار کے صفحات اس کی اجازت نہیں دے رہے۔ اس لیے مختصراً ہی ان کے بارے میں کچھ عرض کرسکوں گا۔

سیّد حامد صاحب ۲۸، مارچ (۱۹۲۰ء) کو یو پی (انڈیا) کے ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول اور کالج کے امتحانات امتیازی نمبروں اور زرّین تمغوں کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں

پاس کیے۔ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا پھر اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی سند لی۔ دونوں میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پہلی پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۴۳ء میں یو۔ پی کی صوبائی سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۹ء میں خصوصی مقابلے کے امتحان اور سلکشن بورڈ سے کامیاب گزرنے کے بعد انڈین اڈمنسٹریٹو سروس سے متعلق ہو گئے۔ مختلف وفاقی وزارتوں کے سکریٹری اور متعدد سرکاری اداروں، کارپوریشنوں اور کمیشنوں کے چیرمین رہے۔ ہر جگہ اپنی قابلیت، محنت، دیانت اور خداداد صلاحیت کی بدولت نیک نام اور کامیاب رہے۔

۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیانی عرصے میں وہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ یونیورسٹی اس وقت کئی طرح کے داخلی اور خارجی انتشار کا شکار تھی، اخبارات سے تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مزید تباہی سے بچانا مشکل ہوگا لیکن سیّد حامد صاحب کی آمد نے بہت جلد یونیورسٹی کی فضائے مسموم کو بہار میں بدل دیا۔ گرتے ہوئے تعلیمی اور انتظامی معیار نے از سر نو سنبھالا لے لیا، یونیورسٹی کا وقار، حکومت اور عوام کی نظر میں بحال ہو گیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا رشتہ، اس عظیم درسگاہ سے پھر قائم ہو گیا۔ اس کے طلبہ و اساتذہ میں کام کرنے کی لگن پھر بیدار ہو گئی اور سیّد حامد کی سربراہی و قیادت میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی ایک بار پھر، حقیقی معنوں میں یونیورسٹی ہو گئی۔

اس اثنا میں سیّد حامد صاحب نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور کئی قابلِ ستائش کام کیے۔ سر سید احمد خاں کے جاری کردہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کو حیاتِ نو بخشی۔ اس سے بھی اہم کام، سیّد صاحب نے یہ کیا کہ مسلمانوں کے دینی مدارس کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کے نصاب پر نظر ثانی کروائی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے نظم و نسق کو سنوارا اور استوار کیا، مختلف یونیورسٹیوں کے اعلیٰ درجات کی اسناد کے مساوی درجہ دلوا دیا۔ ان اقدامات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سیّد حامد صاحب ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے باب میں کم و بیش وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو سر سید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار نے اُنیسویں صدی کے وسط

میں ادا کیا تھا۔

سید حامد صاحب، تقریر و تحریر دونوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ کراچی کے چند روزہ قیام میں انھوں نے انجمن ترقی اردو، کراچی یونیورسٹی، اردو ڈکشنری بورڈ اور علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ کے اجتماعات میں ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ سیاسی و سماجی شعور اور تعلیمی و اقتصادی مسائل پر، جو برجستہ خطبات دیے وہ فکر انگیز بھی تھے اور معلومات افزا بھی، ساتھ ہی ان کے ایک ایک لفظ سے ملک و ملّت کے ساتھ ان کی دردمندی اور دل سوزی کا اندازہ ہوتا تھا، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے حقائق و دلائل کے ساتھ کہہ رہے تھے اور جذبات و محسوسات کی ایسی پُر خلوص شدت کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ان کی بات سامعین کے دل و ذہن میں اُترتی چلی جاتی تھی۔ اچھے خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ سید حامد صاحب ایک ممتاز اہلِ قلم بھی ہیں۔ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور علمی و ادبی و تعلیمی موضوعات کے ساتھ معاشی و سماجی مسائل کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور درجنوں قیمتی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

غالبؔ اور تصوف

غالب کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج بھی برابر لکھا جا رہا ہے، نہ لکھنے والے تھکتے ہیں نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس لئے کہ غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مستقبل بینی کے حیرت انگیز نکات ورُموز پنہاں ہیں۔ غالب نے ایک جگہ اپنے بارے میں کہا تھا کہ:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن غالب کے اس اِدّعا کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی یعنی تصوف کے حوالے سے اُن کے کلام اور شخصیت پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ البتہ بہت دنوں بعد ایک اچھی کتاب ''غالب اور تصوف'' میری نظر سے گزری جی چاہا اور ضروری جانا کہ اس کتاب کا تعارف قارئینِ نگار سے کرایا جائے۔

''غالب اور تصوف'' (مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی) سیّد محمد مصطفیٰ صابری صاحب کی عالمانہ اور فلسفیانہ کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے۔ صابری صاحب تصوف اور شاعری دونوں کے شناور معلوم ہوتے ہیں۔ تبھی انھوں نے اپنے موضوع سے ہر طرح انصاف کیا ہے اور غالبؔ آگاہی کے ساتھ ساتھ تصوف شناسی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

دلّی کے مشہور و ممتاز ناشر جناب محمد مجتبیٰ خان صاحب نے اپنے ادارے ''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی'' سے کتاب، عمدہ کاغذ پر مجلد، بہترین سرورق کے ساتھ شائع کی ہے اور اردو

خدمت وادب دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس ادارے کے ذریعے پچھلے دس بارہ سال میں، اردو زبان وادب کے بارے میں بہت بڑی تعداد میں اور بہت بلند معیار کے ساتھ تحقیقی وتنقیدی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور اس کا امتیازی نشان بن گئی ہیں۔ میں کتاب کے مصنف اور ناشر دونوں کی شکر گزاری کے ساتھ بطور تعارف، اس کتاب کے چند اجزاء نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔

آخر میں ''غالب اور تصوف'' کے ناشر جناب ایم، ایم خان اور ان کے مطبوعاتی ادارے کے بارے میں بھی چند سطریں ہیں۔ یہ سطریں بہترین کتابوں کے حصول میں قارئین کے لئے آسانیاں پیدا کریں گی۔

(نگار، جولائی ۱۹۹۲ء)

کچھ غالب کے بارے میں

اس شمارے کو غالب کے حوالے سے فروری کا شمارہ ہونا تھا لیکن نہ جانے کیسے کیا ہوا کہ پریس کو جاتے جاتے مارچ اور فروری کے شمارے، ایک دوسرے سے بدل گئے۔

اس شمارے میں پانچ مقالات شامل ہیں اور پانچوں، غالب کے بارے میں ہیں۔ غالب کے بارے میں مدیر نگارِ پاکستان کے یہ مقالے پرانے نہیں نئے ہیں اور پچھلے تین برسوں کے اندر لکھے گئے ہیں۔

غالب، اردو کا ممتاز ترین شاعر تو ہے ہی لیکن میرا محبوب بھی ہے اس کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ اسی کے مطالعے نے مجھے سنجیدہ ادب کی طرف راغب کیا۔ میرا پہلا تنقیدی مضمون اکتوبر ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنؤ) میں غالب کے کلام میں استفہام کے نام سے چھپا اور سارے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا، جگہ جگہ نقل ہوا، بار بار شائع ہوا، حوالے کی چیز بنا اور تنقید میں میرے قلم کو معتبر بنایا۔

۱۹۵۲ء کے بعد سے غالب کو میں نے مستقلاً موضوعِ سخن بنائے رکھا اور متعدد تنقیدی مقالات قلم بند کئے حتیٰ کہ ۱۹۶۹ء غالب صدی کے موقع پر ''غالب، شاعر امروز و فردا'' کے نام سے میری کتاب منظرِ عام پر آ گئی اور میرے لئے انعام و توقیر کا وسیلہ بنی۔ پھر بھی میں غالب کے باب میں سیراب نہیں ہوا، غالب اور غالبیات پر برابر غور کرتا رہا اور غالب کی تفہیم کی نئی نئی راہیں ڈھونڈتا رہا۔ یہ راہیں، تازہ مقالات کی صورت اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو غالب کے سلسلے میں بہت کچھ دیں گی اور غالب شناسی میں معاون ثابت ہوں گی۔

(نگار، مارچ ۱۹۹۵ء)

غالبیات

جون کا شمارہ دوسو سالہ جشنِ ولادت کے حوالے سے غالب اور غالبیات کے لیے مخصوص ہے۔اس میں نئے پرانے دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ وہ غالب کے بارے میں مزید غور وفکر اور مزید مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، اُکساتے ہیں اور غالب سے متعلق اردو تنقید کا بے لاگ جائزہ لینے پر ناقدین کو متوجہ کرتے ہیں۔

یہ مضامین انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی کے سہ ماہی ''اردو ادب'' بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۹ء مرتبہ ڈاکٹر اسلم پرویز سے لیے گئے ہیں اور ان کی اجازت اور شکریے کے ساتھ نذرِ قارئین کیے جا رہے ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کا ترجمان سہ ماہی ''اردو ادب'' چوں کہ پاکستان کے قارئینِ ادب کے بہت مخصوص ومحدود حلقے تک پہنچتا ہے اور عام قاری اس کے مطالعے سے محروم رہتا ہے، اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ غالب سے متعلق تازہ شمارے کے وہ چند مضامین جو غالب اور غالبیات کے بارے میں اہلِ فکر ونظر کو از سرِ نو سوچنے اور لکھنے کی دعوت دیتے ہیں، نگار کے قارئین تک ضرور پہنچا دیے جائیں۔

ہم نے اپنا کام کر دیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کیا سوچتے ہیں کیا لکھتے ہیں اور غالب و غالبیات کے سلسلے میں کیا زاویۂ نظر رکھتے ہیں۔

(نگار، جنوری ۱۹۹۹ء)

غالبؔ سے متعلق کتابوں پر تبصرے

''احوال ونقدِ غالبؔ'' مرتب: محمد حیات خاں سیال، ناشر: نذر سنز، لاہور

کتابت وطباعت پاکیزہ، سرورق خوب صورت، کاغذ سفید، صفحات ۸۴۰، مجلد قیمت دس روپے۔

غالبؔ پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اُردو کے کسی اور شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ بایں ہمہ آئے دن اُن پر جو کتابیں اور مقالے شائع ہو رہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی نہ تو لکھنے والے سیر ہوئے ہیں نہ پڑھنے والے۔ خدا جانے ان کے اٹھارہ سو دو اشعار کے مختصر سے دیوان میں کتنے دواوین وکلیات کے مطالب سموئے ہوئے ہیں اور خدا جانے ان کی بہتر سالہ زندگی میں کتنی صدیاں اور کتنے عہد چھپے ہوئے ہیں کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے برابر لوگ ان کے کلام کے ایک ایک نکتے اور ایک ایک خصوصیت کی تشریح کئے جا رہے ہیں اور ان کی زندگی کے ایک ایک سانس اور ایک ایک لمحے کی تفصیل لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن سلسلہ ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جب کبھی ان کا دیوان دیکھئے اور جو کچھ ان پر لکھا گیا ہے، اس پر نظر ڈالئے تو یہی احساس ہوتا ہے جیسے ابھی ان کی شاعری اور شخصیت دونوں تشنۂ تحقیق وتفسیر ہیں۔ شاید اسی احساس کے تحت محمد حیات خاں سیال نے اس طرف توجہ کی ہے اور غالب کی مکمل تصویر پیش کرنے کے شوق میں، منتخب تحریروں کے ذریعے ایک ایسی جامع کتاب مرتب کر دی جسے غالب پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں۔

کتاب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ محمد حیات خاں سیال، تدوین وتزئین کتب کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کمالِ احتیاط سے غالب کی زندگی اور شخصیت کے سارے ایسے پہلوؤں کو

سامنے رکھا ہے جو غالب کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ پھر ان کی تشریح و تفہیم کے لئے ایسے مقالات انتخاب کئے ہیں جو ہر پہلو کو واشگاف کر کے قاری کے سامنے لے آتے ہیں اور قاری کے ذوق نقد و نظر کو سیراب کر جاتے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین اور انتخاب مقالات کے سلسلے میں مرتب کو کتنا کچھ پڑھنا پڑا ہوگا اور کتنی عرق ریزی و جانفشانی سے کام لینا پڑا ہوگا اس کا صحیح اندازہ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی ممکن ہے۔ یقین ہے کہ یہ کتاب ہر حلقے میں مقبول ہوگی اور غالب شناسی و غالب فہمی کی نئی راہیں کھولے گی۔

(نگار، ستمبر ۱۹۶۷ء)

"روح المطالب فی شرحِ دیوانِ غالب" از شاداں بلگرامی (مرحوم)

کلامِ غالب کی ایک دو نہیں، درجنوں شرحیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ شارحین میں معمولی حیثیت کے بھی لوگ ہیں اور مولانا حسرت موہانی، نظم طباطبائی، بے خود دہلوی، عبدالباری آسی اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے بلند مرتبہ ادیب و شاعر بھی۔ لیکن کلامِ غالب کی افہام و تفہیم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ آئے دن ان پر جتنا کچھ لکھا جا رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

شاداں بلگرامی کی زیر نظر شرح دیوانِ غالب اسی سلسلہ تفسیر کی اہم کڑی ہے اور اس کی اہمیت یوں زیادہ ہو جاتی ہے کہ بعض قدیم شرحوں سے استفادہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ علامہ شاداں بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں کو خصوصیت سے سامنے رکھا ہے اور جن پہلوؤں کو یہ حضرات تشنہ چھوڑ گئے تھے۔ انھیں تفصیل و تشریح سے سیراب کر دیا ہے۔ جہاں جہاں مطالب میں اختلاف کی صورت پیدا ہوئی ہے وہاں وہاں اوّل الذکر دونوں کی رائیں نقل کر دی ہیں اور بعد ازاں اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔ شاداں صاحب نے یہ بھی کیا ہے کہ ہر شعر کے مفہوم کے ساتھ ساتھ مشکل الفاظ و محاورات کے معنی بھی درج کر دیئے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ قاری کو لفظ و معنی کی جملہ خصوصیات و نکات کے ساتھ، شعر سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ شرح کلام سے پہلے چوں کہ اس کتاب میں تسامحات و زلات کے نام سے کلام غالب کی بعض بے اعتدالیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں شرح کے

ساتھ ساتھ تنقید کلام کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی اسی جامعیت سے توقع ہے کہ، دوسری شرحوں کی طرح یہ بھی عام و خاص میں مقبول ہو گی۔

۶۱۸ صفحات کی یہ کتاب شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب لاہور سے بارہ روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔

(نگار، مارچ ۱۹۶۸ء)

"نذرِ غالبؔ" مرتب، غلام جیلانی اصغر؛ ناشر، سرگودھا اکیڈمی

کتابت و طباعت پاکیزہ، کاغذ سفید، صفحات ۱۴۴، قیمت ایک روپیہ

"نذرِ غالبؔ" جسے سلسلۂ جشنِ غالبؔ، کی ایک کڑی کہنا چاہئے، انتخاب ہے ان منظومات و مقالات کا، جو سرگودھا اکیڈمی کی تقریبات غالب میں پڑھے گئے تھے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل بخاری، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، قیوم شاکر، اختر امان، سجاد نقوی اور وقار النساء آغا کے نام شامل ہیں۔ یہ مقالات اگرچہ مختصر ہیں لیکن بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق ہیں، ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ غالبؔ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے رسماً نہیں کہی گئیں بلکہ ان کا انداز اور پس منظر مقالہ نگاروں کے وسیع مطالعے اور گہرے سوچ بچار کا پتہ دیتا ہے، چنانچہ نذرِ غالب کی تحریریں، اپنے قاری کو سرسری نہیں گزرنے دیتیں بلکہ اسے کتاب کے لفظ بہ لفظ مطالعہ پر مجبور کر دیتی ہیں۔

منظومات میں ڈاکٹر وزیر آغا، رشید قیصرانی، غلام جیلانی اصغر، انور سدید اور بعض دوسرے شعراء کی ایسی غزلیں شامل ہیں جو غالب کی زمین

"آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

میں کہی گئی ہیں اور لطف سے خالی نہیں ہیں۔

(نگار، مئی ۱۹۶۹ء)

"نذرِ غالبؔ"

غالب اور غالبیات سے متعلق پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

۱- غالبؔ بہ یک نگاہ
۲- غالبؔ اقبالؔ کی نگاہ میں
۳- غالبؔ اپنے آئینے میں
۴- غالبؔ میری نظر میں
۵- غالبؔ کی فارسی غزل پر تضمین
۶- غالب و غالب سخنداں
۷- غزلیات بر زمینِ غالب

آخر الذکر عنوان کے تحت عطا کاکوی کی انیس غزلیں ہیں، یہ غزلیں غالبؔ کی مشہور و مقبول زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ ہرچند کہ کسی استاد کی زمین میں غزل کہنا، خصوصاً غالبؔ جیسے ایجاد پسند معجز بیاں شاعر کی زمینوں کو ہاتھ لگانا۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن یہ غزلیں اپنے اندر کچھ ایسی دلکشی کا سامان رکھتی ہیں کہ ادب کا قاری غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ عطا کاکوی کی قادر الکلامی اور فکر رسا کا بھی قائل ہو جاتا ہے۔

۹۶ صفحات کی کتاب عظیم الشان بک ڈپو پٹنہ نے سفید کاغذ پر شائع کی ہے۔ قیمت دو روپے ہے۔

(نگار، اگست ۱۹۶۹ء)

"فلسفۂ کلامِ غالب"

غالبؔ پر لکھنے کو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آج بھی برابر لکھا جا رہا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ غالبؔ کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں چند گنے چنے اہلِ قلم نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ انھیں گنے چنے لکھنے والوں میں ایک ممتاز نام ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری عربی، فارسی کے ساتھ ساتھ علم کلام، فلسفہ، مذہبیات، علم لسان اور بیان و بدیع پر

پہنچے اور ''فلسفہ کلام غالب'' کے عنوان سے ایک فکر انگیز کتاب لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

''فلسفۂ کلام غالب'' اوّل اوّل اب سے اٹھارہ انیس سال پہلے، غالب پر ایک چونکا دینے والی تصنیف کی حیثیت سے منظر عام پر آئی تھی اور چند برسوں میں نایاب ہوگئی تھی۔ زیر نظر کتاب اس کا تازہ اڈیشن ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سارے مباحث پر مصنف نے از سر نو نظر ڈالی ہے۔ پہلے اڈیشن پر مبصروں اور ناقدوں نے جو رائیں دی تھیں ان سب پہلوؤں پر بحث کا اضافہ کیا ہے۔ جو پہلے اڈیشن میں نظر انداز ہو گئے تھے، گویا تازہ اڈیشن جسے نقشِ ثانی کہنا چاہئے نقشِ اوّل سے ہر طرح بہتر ہے اور غالب کو سمجھنے سمجھانے کی راہوں کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ کشادہ کر دیتا ہے۔

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فکر و خیال یا زبان و بیان کا کہیں اُلجھاؤ نہیں ہے۔ موضوع ہر چند کہ ادق تھا اور اس پر گفتگو بھی حد درجہ سنجیدہ، عالمانہ اور منطقی انداز سے ہی ہو سکتی تھی لیکن موضوع چونکہ سبزواری صاحب کے ذہن میں پوری طرح واضح تھا اور وہ اپنی بات کو مدلل بنا کر پیش کرنے میں قدرت بھی رکھتے ہیں، اس لئے انھوں نے بڑی آسانی سے موضوع زیر بحث کو دوسروں کے ذہن میں اُتار دیا ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو ڈاکٹر سبزواری کو غالب کے فکر و فن پر لکھنے والوں میں بہت ممتاز کر دیتی ہے۔

تین سَو صفحات کی کتاب خوبصورت ٹائپ میں، سفید کاغذ پر، پاکیزہ طباعت و جلد بندی کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور بارہ روپے میں مل سکتی ہے۔

(نگار، جون ۱۹۶۹ء)

''غالب: ۱۸۶۹ء-۱۹۶۹ء''

مصوری، خطاطی اور حُسنِ کلام غالب کا ایک قابلِ توجہ مرقع ہے جو غالب کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر، ڈائری کے روپ میں یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ کراچی کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا ہے۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک دو نہیں سیکڑوں چیزیں منظر عام پر آئی ہیں۔ غالب پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور مقالات شائع ہوئے ہیں، دیوانِ غالب اور کلامِ غالب کے

منتخبات چھپے ہیں، غالبؔ کے کلام اور نثر کے ترجمے کیئے گئے ہیں، ادبی رسائل نے غالبؔ نمبر نکالے ہیں، ادبی انجمنوں نے مباحثے اور مذاکرے منعقد کرائے ہیں۔ غالبؔ کے نام کے کیلنڈر جاری کیئے گئے ہیں اور بہت سی چیزیں ان کے نام سے منسوب کر کے بطور خراج تحسین اس موقع پر پیش کی گئی ہیں، یہ سب چیزیں قابلِ توجہ ہیں لیکن ان سب کا دائرۂ اثر محدود ہے۔ زیرِ نظر ڈائری البتہ اس نوع کی چیز ہے جو اپنی گوناگوں خوبیوں کے سبب عام و خاص سب کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔ اس کے ذریعہ غالبؔ کا نام اور کلام پاکستان سے باہر دوسرے ملکوں تک پہنچا ہے اور اس حسنِ سلیقہ کے ساتھ کہ غالبؔ کی روح، اس سے ضرور خوش ہوئی ہوگی۔

پوری ڈائری بڑے سائز میں دبیز آرٹ کاغذ پر شائع کی گئی ہے اور شروع سے آخر تک غالبؔ کی ایک نظر گیر تصویر ہے، یہ تصویر غالبؔ کے مزاج، لباس، شکل و صورت، انداز نشست و کتابت اور ماحول سب کی ترجمان ہے۔ اس تصویر میں صرف سادہ لکیروں سے کام لیا گیا ہے لیکن اس خوبی کے ساتھ کہ اگر کسی باذوق کے ہاتھ میں آجائے تو سب لکیریں ہاتھ کی رگِ جاں بن جائیں۔ اس کے بعد غالب کے ہاتھ کی تحریر کا نمونہ اور غالب پر اقبال کی مشہور نظم ہے، درمیان میں صادقین صاحب کے بنائے ہوئے تصویری مرقعے ہیں۔ یہ مرقعے غالب کے بعض اشعار کی محاکاتی تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں اور ناظرین کے دلوں پر غالب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ مصوّر کی فنی عظمت کا سکہ بھی بٹھا دیتے ہیں۔ ہر صفحے کے چار حصّے ہیں، چوتھا حصہ انتخابِ کلامِ غالب کے لئے مخصوص ہے اور غالب کے فکر و فن کے ساتھ ساتھ خطاطی کی بڑائی کا بھی احساس دلاتا ہے، مختصر یہ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ڈائری کیا ہے، شعر و مصوّری و فن خطاطی کا ایک قیمتی مرقع ہے اور مرتبین کی نفاست طبع، ذوقِ لطیف اور حسن سلیقہ کا آئینہ ہے، یقین ہے کہ فنونِ لطیفہ کا یہ شاہکار ایک طرف یونائیٹڈ بینک کے نام کو اونچا کرے گا۔ دوسری طرف دوسرے اداروں کو اس قسم کے کام کے لئے اُکسائے گا۔

(نگار، جون ۱۹۶۹ء)

"غالبؔ اور مطالعۂ غالبؔ"

پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر اور پاکستان کے ممتاز صاحب قلم ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تصنیف ہے۔ غالبؔ کے متعلق اِدھر متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ سیکڑوں مقالے لکھے گئے ہیں اور اکثر ادبی رسائل کے "غالب نمبر" شائع کئے گئے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں ساری چیزیں کام کی نہیں ہیں، ہاں ایک منتخب حصہ ایسا ضرور ہے جسے تحقیق و تنقید کے لحاظ سے معیاری ادب کا درجہ دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی زیر نظر تصنیف اسی منتخب حصے کے تحت آتی ہے اور قارئین کو متعدد وجوہ سے اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو شروع ہی سے غالبؔ کی ذات وصفات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ اس دلچسپی کا ایک واضح ثبوت ان کا وہ مقالہ ہے جو علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اب سے کوئی بیس بائیس سال پہلے شائع ہوا تھا، اس مقالے میں عبادتؔ صاحب نے غالبؔ کے فکر وفن کو ایک خاص زاویے اور ایک خاص انداز سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ زیرنظر کتاب اسی کوشش کی تکمیلی صورت ہے۔

ڈاکٹر عبادت نے اس کتاب میں غالبؔ کی زندگی، شخصیت ماحول، تصانیف، شاعری، شاعری کی عظمت، خطوط، کی ادبیت واہمیت اور غالبؔ کے اہم ناقدین سب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے اور ایسی تفصیل وتوضیح کے ساتھ کہ غالبؔ کی زندگی اور فن کا ہر پہلو پوری طرح بے نقاب ہو کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ سادگی اور وضاحت اور تجزیہ وتحلیل جس سے عبادت کا اندازِ تحریر عبارت ہے، اس کتاب میں بھی ہر ورق پر نمایاں ہے اور قاری کے آسودگی ذوق کا پورا سامان فراہم کرتا ہے۔

۵۰۰ صفحے کی مجلد کتاب خوبصورت ٹائپ میں سفید کاغذ پر دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور بیس روپے میں رائٹرا کیڈامی لاہور سے مل سکتی ہے۔

(نگار، اگست ۱۹۶۹ء)

''ہنگامۂ دلِ آشوب''

''ہنگامۂ دلِ آشوب'' غالبؔ اور غالبیات سے متعلق ایک نہایت دلچسپ اور اہم کتاب ہے، اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ بُرہانِ قاطع کی رد میں جب غالب نے ''قاطع برہان'' لکھی تو دونوں کتابوں کی تائید وتردید کا ایک طویل سلسلہ چھڑ گیا اور ادب کے سارے عام و خاص قاری اس میں کسی نہ کسی طور پر شریک ہو گئے۔ بحث کا آغاز اگرچہ علمی وادبی سنجیدہ نثر سے ہوا تھا۔ لیکن آگے بڑھ کر منظوم تحریریں بھی دونوں جانب سے شائع ہونے لگیں اور ان تحریروں میں سنجیدہ وغیر سنجیدہ ہر قسم کا لب ولہجہ در آیا۔ گویا لغت کے سلسلے کا یہ ایک علمی مناظرہ یا مباحثہ نہ تھا بلکہ ادبی ہنگامہ تھا جس نے کسی ایک شہر کو نہیں بلکہ اکثر شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس لحاظ سے جس نے بھی ''برہانِ قاطع'' اور ''قاطع برہان'' کی ساری بحثوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں اسے ''ہنگامۂ دلِ آشوب'' کا نام دیا ہے بہت موزوں نام دیا ہے۔

''ہنگامۂ دلِ آشوب'' اوّل اوّل ۱۸۶۷ء میں کتابی صورت میں اور بعد ازاں سیّد عطا حسین کے توسط سے جنوری ۱۹۳۷ء کے رسالہ اُردو میں شائع ہوئی۔ اس کی نایابی اور اہمیت کے پیش نظر انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے اسے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر کتابی صورت میں شائع کیا ہے، کتاب فی نفسہٖ بہت اہم ہے لیکن کتاب کے مرتب سیّد قدرت نقوی نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ کتاب کے تعارف کے سلسلے میں ان کا بسیط مقدمہ اصل کتاب میں مذکورہ شخصیتوں کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور بعض امور و مسائل کے سلسلے میں ان کی توضیحات، ایسی چیزیں ہیں جو ایک طرف کتاب کی افادیت کو بڑھاتی ہیں تو دوسری طرف مرتب کی عرق ریزی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

۱۹۲ صفحات کی مجلد کتاب سات روپے میں انجمن ترقی اردو کراچی سے مل سکتی ہے۔

(نگار، اگست ۱۹۶۹ء)

سہ ماہی ''صحیفہ'' غالبؔ نمبر، (حصہ اوّل، دوم، سوم)

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی   ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور

غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر اردو کے سارے ادبی پرچوں نے غالبؔ نمبر شائع کئے ہیں، اس سے انکار نہیں کہ ہر نمبر میں کچھ باتیں کام کی ہیں، لیکن ان میں ایسے پرچے بھی ہیں، جن کا بیشتر حصہ رطب و یابس اور طوالت بے جا یا تکرار محض کے تحت آتا ہے۔ چند پرچوں کے غالبؔ نمبر البتہ ایسے ہیں جو غالبؔ اور غالبیات کے سلسلے میں لوح سے تمت تک ''دامنِ دل می کشد'' کے مصداق ہیں، انھیں میں ایک نام ''صحیفہ'' کا ہے، بلکہ صحیفہ کو دوسرے پرچوں پر یوں فوقیت حاصل ہے کہ اس نے ۱۹۶۹ء کی ساری اشاعتوں کو غالبؔ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس کے تین شمارے غالب نمبر، حصہ اوّل، غالب نمبر حصہ دوم اور غالب نمبر حصہ سوم منظر عام پر آ چکے ہیں۔ چوتھا شمارہ زیر ترتیب ہے۔ گویا، صحیفہ، نے غالبؔ کی شخصیت اور فن کے جملہ پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش ایسی کامیاب ہے کہ دوسرے پرچوں کے لئے قابلِ رشک ہے۔ صحیفہ کے لکھنے والوں میں چونکہ بیشتر وہ لوگ ہیں جنھیں ماہر غالبیات کی حیثیت حاصل ہے یا وہ جنھوں نے برسوں کے مطالعہ کے بعد غالبؔ کی شخصیت اور فن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی ہے۔ اس لئے مقدار و معیار، ہر لحاظ سے ''صحیفہ'' کے غالب نمبر، موضوع زیر بحث کے سلسلے میں مستند تاریخی دستاویز بن گئے ہیں۔ پہلا حصہ دس روپے، دوسرا حصہ دو روپے پچاس پیسے اور تیسرا حصہ دو روپے پچاس پیسے۔

(نگار، اکتوبر ۱۹۶۹ء)

''محاسنِ کلامِ غالبؔ''   از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم

ناشر: فخری پرنٹنگ پریس، کراچی

کاغذ سفید، ٹائپ خوبصورت، طباعت نفیس۔   قیمت: چار روپے

اس سال غالبؔ کے جشنِ صد سالہ کے بہانے غالب کے سلسلے میں متعدد کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ اُردو کے اکثر رسائل نے غالب نمبر شائع کئے ہیں، بعض پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو غالبؔ اور غالبیات کی ساری

تصنیف وتالیفات کے ذخیرے میں دو کتابیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔

ایک مولانا حالی کی ''یادگارِ غالب''

دوسری ڈاکٹر بجنوری کی ''محاسنِ کلامِ غالب''

یہی دو کتابیں ہیں جن کی اشاعت کے بعد ہم نے غالب کو پہچانا ہے۔ ان کو ذوق سے بڑا شاعر مانا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہوئے ہیں ان کی زندگی اور کلام سے ہماری دلچسپی بڑھی ہے۔ ہم نے ان کی تصانیف ومجموعہ ہائے کلام کا کھوج لگایا ہے اور ان کی آفاقی وشاعرانہ حیثیت سے متعارف ہونے اور متعارف کرانے کی کوشش کی ہے، یہ کوشش جو حالی اور ڈاکٹر بجنوری سے شروع ہوئی تھی، آج تک جاری ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ غالب کے سلسلے میں ہزاروں صفحے لکھے جانے کے بعد بھی نہ تو یادگارِ غالب جیسی اب تک کوئی کتاب منظر عام پر آئی اور نہ ''محاسنِ کلامِ غالب'' جیسا مقالہ شائع ہوا۔ ''محاسنِ کلامِ غالب'' مقالے کی صورت میں اوّل اول ۱۹۲۱ء میں رسالہ اردو میں شائع ہوا پھر نسخۂ حمیدیہ اور دوسرے رسائل کی زینت بنا۔ بعد ازاں انجمن ترقی اردو ہند سے چھاپا لیا۔ اس کے بعد غالب کے جشن صدسالہ کے موقع پر یہ مقالہ بعض غالب نمبروں میں شامل کیا گیا۔ لیکن کتابی صورت میں اس کا کوئی مفید اور خوبصورت ایڈیشن منظر عام پر نہ آسکا تھا، زیرِ نظر ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے فخری ایڈیشن نے اس کمی کو پورا کر دیا۔

کتاب کی طباعت، ٹائپ کے انتخاب، جلد بندی اور سرورق کی تزئین سب میں حسن سلیقہ کا ثبوت دیا گیا ہے، بلکہ اس نسخے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو ہر طرح سے مستند بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ رسالہ اردو نسخۂ حمیدیہ اور دوسرے مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کے متن کی اصلاح کی گئی ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کتاب ''غلط نامہ'' کے بدنما داغ سے محفوظ ہوگئی ہے، یقین ہے کہ محاسن کلام غالب کا فخری صدی ایڈیشن جسے مالکان فخری پریس کے سلسلہ مطبوعات کی پہلی کڑی کہنا چاہئے۔ مرزا غالب کے مداحوں میں خصوصاً اور ادبی حلقوں میں عموماً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(نگار، اکتوبر ۱۹۶۹ء)

”غالبؔ کون ہے؟“

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں اردو کے ممتاز اہلِ قلم سیّد قدرت نقوی نے غالب کی زندگی اور فن پر عالمانہ بحث کی ہے اور غالب کو حقیقی خال وخط کے ساتھ ہمارے سامنے لے آتے ہیں، سیّد قدرت نقوی اردو کے ان ادیبوں میں سے ہیں جو گہرے مطالعہ کے بغیر کسی موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے۔ نتیجۃً اُن کی تحریریں ہر حلقے میں شروع ہی سے وقیع خیال کی جاتی ہیں۔ غالبؔ پر انھوں نے ایک دو نہیں درجنوں مضامین لکھے ہیں اور ان میں سے کوئی مضمون ایسا نہیں جسے حرفِ مکرر یا تکرارِ بے جا سے تعبیر کیا جاسکے ہر جگہ انھوں نے ایسی دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے کہ ان کا نام غالبیات کے سلسلے میں بہت اہم ہوگیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب سات مضامین پر مشتمل ہے۔ ابتدائی مضمون غالب کی زندگی اور آخری چار غالب کے فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر مضمون صاحب کتاب کے علم وفضل اور قوت نقد وتحقیق کا مرقع ہے اور غالب وکلام غالب کے بعض ایسے گوشوں کو منور کرتا ہے جو اس سے پہلے دُھندلے اور غیر روشن تھے، یقین ہے کہ یہ کتاب نہ صرف غالب کے طرف داروں بلکہ سخن فہموں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور صاحب کتاب کی بصارت وبصیرت کا سکہ بٹھائے گی۔

۲۰۸ صفحوں کی کتاب، مضبوط جلد، دیدہ زیب سرورق اور عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے اور چھ روپے میں دانش کدہ حسین آگاہی ملتان سے مل سکتی ہے۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷ء)

”نقوش، غالبؔ نمبر“ (حصہ دوم)

غالبؔ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر اُردو کے بیشتر پرچوں نے غالب نمبر شائع کئے ہیں اور اس سے انکار نہیں کہ ہر نمبر کسی نہ کسی طور پر افادیت کا مالک ہے۔ پھر بھی نقوش کے غالب نمبر (حصہ اوّل) کی حیثیت ان نمبروں میں بھی خاص الخاص کی تھی۔ لیکن نقوش (غالب نمبر حصہ دوم) جو کہ غالب کی نو دریافت بیاض پر مشتمل ہے اور اس وقت ہمارے پیش نظر ہے بلحاظ افادیت واہمیت دوسرے پرچوں کے سارے غالب نمبروں کو حتیٰ کہ خود نقوش کے حصہ اوّل کو بھی مات کرگیا۔

پچھلے سال جب یہ خبر ملی کہ دیوانِ غالبؔ کا ایک ایسا خطّی نسخہ ہاتھ آ گیا ہے جو سارے موجودہ نسخوں سے پرانا ہے تو ادبی حلقوں میں عموماً اور غالبؔ کے طرف داروں میں خصوصاً خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن اہلِ پاکستان کے لئے یہ خوشی ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب کا انداز لئے ہوئے تھی۔ سبب یہ تھا کہ یہ قدیم ترین نسخہ ہندوستان میں دریافت ہوا تھا اور غالب کی برسی کے موقع پر اس کے پاکستان پہونچنے کے امکانات نہ تھے۔ خدا بھلا کرے محمد طفیل مدیر نقوش کا جنھوں نے اس نسخے کی فوٹو اسٹیٹ نقل حاصل کی اور اسے بہت جلد غالب نمبر حصہ دوم کی صورت میں منظر عام پر لے آئے اور ہماری بے چینی کو روحانی مسرت میں بدل دیا۔ حق یہ ہے کہ موجودہ صورت میں نقوش کا غالب نمبر غالبیات کے سلسلے میں سب سے اہم اور قیمتی دستاویز ہے جو ہم تک پہونچی ہے اور اس سلسلے میں مدیر نقوش کے ہم جس قدر شکر گزار ہوں کم ہے۔ مدیر نقوش نے یہ بہت اچھا کیا کہ ایک صفحے پر اصل نسخے کی فوٹو اسٹیٹ نقل دے کر اس کے سامنے دوسرے صفحے پر متن کو نستعلیق میں منتقل کر دیا۔ اس سے یہ ہوا کہ اصل نسخہ حد درجہ کار آمد ہو گیا اور غالب و کلام کے مطالعہ کی نئی راہیں نکل آئیں۔ رہی اس قدیم نسخے کی دریافت کی کہانی اور اس کی افادیت و اہمیت کی دوسری تصریحات، سو یہ بھی مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور نثار احمد فاروقی کے مقالات مشمولہ نقوش غالب نمبر حصہ دوم (نو دریافت بیاض) میں سمٹ آئی ہیں اور نقوش کا اب یہ نمبر صرف ایک نمبر نہیں رہا بلکہ غالبیات کے سلسلے کی سب سے قیمتی اور اہم دستاویز بن گیا ہے۔

۳۸۴ صفحے کا یہ دیدہ زیب اور قیمتی صحیفہ صرف تیس روپے میں مل سکتا ہے۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷۰ء)

''ادبِ لطیف (غالبؔ نمبر)'' مدیر: ناصر زیدی۔ صفحات: ۳۴۰۔ قیمت: ۵ روپے

ایک زمانہ تھا کہ ''ادبِ لطیف'' اُردو کے چند گنے چنے معیاری پرچوں میں شمار ہوتا تھا اور اس میں کسی کے نام کا چھپنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی، لیکن مرزا ادیب کے جانے کے بعد، اس پر زوال آیا، اور کئی سال تک اس کی اشاعت ایسی ڈانواں ڈول رہی کہ، بظاہر اس کے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، لیکن ایسے موقعوں پر آپ جانتے ہیں کہ ''مردے از غیب بروں آید و کارے کند'' یہی ہوا، ایک جواں سال اور با عزم شاعر و ادیب ناصر زیدی سامنے آئے اور ''ادبِ لطیف'' کے

مردہ جسم میں ایک بار پھر تازہ روح پھونک دی۔ اس تازہ روح کی تازگی کا تازہ ترین ثبوت ''اس کا زیرِ نظر شمارہ'' ''غالب نمبر'' ہے۔

غالبؔ کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر ہر پرچے نے ''غالب نمبر'' شائع کیا ہے اور حق بات یہ ہے کہ کوئی پرچہ افادی پہلوؤں سے خالی نہیں ہے۔ ''ادبِ لطیف'' کی بھی یہی صورت ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ غالب کے فکر و فن کے بارے میں موضوعات اور مواد کی رنگا رنگی کی بدولت اس پرچے کی افادیت میں بھی ایک طرح کی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس خاص نمبر کو مندرجہ ذیل خاص ابوابؔ میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) دروازۂ خاور کھلاؔ۔ (۲) رشکِ فارسی۔ (۳) نقش ہائے رنگ رنگ۔ (۴) ذکر اس پری وش کا (۵) پردۂ ساز۔ (۶) گلِ نغمہ۔ (۷) شوخیٔ تحریر۔ (۸) حکایت خونچکاں۔ (۹) بحضورِ غالبؔ اور اس انجمنِ گل میں۔۔

گویا ابواب کے عنوانات کا انتخاب بھی کلامِ غالب سے کیا گیا ہے۔ ابتدائی تین حصّوں میں، غالب کی اُردو، فارسی شاعری کا انتخاب ہے۔ ایسا انتخاب، جس میں انتخاب کرنے والے کی رسوائی کا خطرہ نہیں ہے اور یہ کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔ ''ذکر اس پری وش'' کے تحت، غالب کی زندگی اور فکر و فن سے متعلق مقالات ہیں اور اپنی کیفیات و اطلاعات کے لحاظ سے، اُن میں بعض بالکل نئے ہیں۔ اس کے بعد ''خراجِ عقیدت'' کے طور پر غالبؔ کے حضور میں متعدد شعراء کی نظمیں اور بعد ازاں غالبؔ کی غزلوں پر غزلیں ہیں۔ ''شوخیٔ تحریر'' کے عنوان سے مزاح کا عنصر لئے ہوئے مضامین و منظومات ہیں۔ ''حکایتِ خونچکاں'' کے تحت، تقریباتِ غالبؔ کے سلسلے کا ایک طویل رپورتاژ ہے، ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ خاص نمبر کتنا رنگا رنگ ہے اور اُس کی یہی رنگا رنگی اسے دوسرے غالب نمبروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷۰ء)

''دیوانِ غالبؔ (نسخۂ حمیدیہ)'' مرتب: پروفیسر حمید احمد خاں
ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور

''نسخۂ حمیدیہ'' دیوانِ غالب کا وہ خطّی نسخہ ہے جو بھوپال کے کتب خانۂ حمیدیہ میں دستیاب ہوا، اور مفتی انوار الحق کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں پہلے پہل طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ ۱۸۲۱ء میں تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۴، ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔ غالب کی شخصیت اور اندازِ کلام کی بہت سی ناکشادہ گرہیں دراصل اسی نسخے نے کھولی ہیں۔

اس نسخے کی از سرِ نو اشاعت دو سبب سے بہت ضروری تھی اوّل یہ کہ نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق ایک مدت سے نایاب تھا اور اس سے استفادہ کرنے کی کوئی صورت باقی نہ تھی، دوسرے یہ کہ مفتی صاحب کے نسخے میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جن کا ازالہ بہت ضروری تھا۔ یہ کام ہر ایک کے بس کا نہ تھا، سخت جانکاہی و دیدہ ریزی چاہتا تھا اور ایک ایسے صاحبِ قلم کا طالب تھا جو سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالبؔ کا طرف دار بھی ہو۔ خوش قسمتی سے مجلس ترقی ادب لاہور کو حمید احمد خاں صاحب کے روپ میں یہ آدمی مل گیا اور جس کام کو ہم نے آپ نے مشکل سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اُن کے ہاتھوں بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا گیا، مجھے یقین ہے کہ غالب کی روح، اس کام سے بالخصوص خوش ہوئی ہوگی۔

نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق کے متن و ترتیب میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں، پروفیسر حمید احمد خاں نے صرف یہی نہیں کہ دقتِ نظر کے ساتھ انھیں دور کیا ہے بلکہ ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے، مجلس ترقی ادب لاہور نے اسے شائع بھی بڑے سلیقے سے کیا ہے، اس میں طباعت و کتابت کی وہ کمزوریاں نہیں ہیں جو نسخہ حمیدیہ کی اوّلین اشاعت میں نظر آتی ہیں۔ کتاب خوبصورت ٹائپ میں دبیز کاغذ کے ۲۹۰ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے اور پندرہ روپے میں مل سکتی ہے۔

(نگار، مئی۔ جون ۱۹۷۰ء)

''غالبؔ اور انقلاب ستاون'' از ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن
ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

مجلّد، خوبصورت سرورق، کاغذ سفید، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۱۶، قیمت پندرہ روپے۔

غالبؔ اور غالبیات پر ایک دو نہیں سیکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ لکھنے والے تھکتے ہیں نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ غالب کا ہر بالغ نظر نقاد اس کی شخصیت اور کلام سے کوئی ایسا اچھوتا پہلو اپنی گفتگو کے لئے نکال لیتا ہے کہ وہ علم و ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، کم از کم مدنظر کتاب کی یہی صورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے غالب کی زندگی اور فکر و نظر کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو ابھی تک غالبؔ کے عام قاری ہی سے نہیں خاص سے بھی پوشیدہ تھیں۔

ہر چند کہ کتاب کی اساس غالبؔ کی مشہور کتاب ''دستنبو'' پر قائم ہے لیکن مصنف نے ''دستنبو'' کے حوالے سے غالب کے متعلق اتنا قیمتی اور نیا مواد اس کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ جو لوگ غالبؔ کے ذہن کو فی الواقع پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ غالبؔ نے دستنبو کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران روزنامچے کے انداز میں لکھا تھا لیکن کچھ ایسے پینترے کے ساتھ کہ ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں میں سرخرو بنے رہ سکیں اور دوسری طرف فرنگی حکمرانوں کی خوشنودی بھی حاصل کر سکیں۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لئے انھوں نے دستنبو کو کس انداز سے مرتب کیا تھا اور اس کے لئے فارسی کا کونسا اسلوب اختیار کیا تھا اس کی تفصیل اس جگہ ممکن نہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن نے دستنبو کو پہلے اردو میں منتقل کیا پھر اس ترجمے کو ضروری حواشی و تعلیقات اور مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس طرح ''دستنبو'' کے مطالب و مباحث تک عام و خاص سب کی رسائی ہو گئی اور غالب کے بارے میں کئی ایسی باتیں سامنے آ گئیں جو صرف نئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے حیرت انگیز بھی ہیں۔ دستنبو کو اُردو میں منتقل کرنا۔ اس کے نکات کو سمجھنا اور اس کے منظر اور پس منظر پر وثوق سے گفتگو کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف چونکہ غالبیات کے پی ایچ ڈی ہیں اور غالب کا مطالعہ ان کی ادبی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا ہے اس لئے وہ اس مشکل کام سے بہ آسانی گزر گئے ہیں اور غالبؔ پر

ایک ایسی کتاب دے دی ہے جو غالبؔ کے سلسلے میں کئی کتابوں کی محرک بن سکتی ہے۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷۷ء)

''حیاتِ غالبؔ کا ایک باب''

غالبؔ بھی اُردو کا عجیب شاعر ہے، نہ لکھنے والے تھکتے ہیں نہ پڑھنے والے۔ پڑھنے والوں کا کمال یہ ہے کہ وہ غالبؔ پر لکھی گئی ہر اچھی بُری تحریر سے واقف رہنا چاہتے ہیں اور لکھنے والوں کی جگرداری یہ ہے کہ وہ غالبؔ کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے ہیں کہ ادب کے طالب علموں اور غالب کے طرف داروں کو بہرحال اس طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر کی تازہ کتاب کی یہی صورت ہے۔ یہ اپنے موضوع و مواد کے لحاظ سے بالکل اچھوتی کتاب ہے اور حیات غالبؔ کی جزئیات سے شناسائی کے سلسلے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

غالبؔ کی پنشن کا قضیہ، غالب کی زندگی کا ایک بہت دلچسپ اور اہم باب ہے۔ اس کا ذکر غالبؔ کے اکثر سوانح نگاروں نے کسی نہ کسی طور پر کیا ہے لیکن قضیے کی دستاویز تفصیلات پہلی بار ڈاکٹر ملک حسن اختر کے ذریعے سامنے آئی ہیں۔ یہ دستاویزیں پنجاب آرکائیوز میں پڑی تھیں، جنھیں ڈاکٹر حسن اختر کی نگاہ دوررس نے ڈھونڈ نکالا اور یہ ایک بسیط مقدمے کے ساتھ مکتبہ عالیہ لاہور کی معرفت منظر عام پر آ گئیں۔ کیا عجب کہ اس سے حیاتِ غالب کے سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات پیدا ہوں اور تفہیم غالب کے لئے نئی راہیں ہموار ہوں۔

(نگار، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

''اشاریۂ غالبؔ'' مرتب: سیّد معین الرحمٰن

ناشر: مجلس یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

خوبصورت ٹائپ، عمدہ طباعت، سفید کاغذ، مجلد، صفحات ۴۹۰، قیمت درج نہیں ہے۔

ادھر پچھلے دو سال، غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر، غالبیات کے سلسلے میں اتنا زیادہ کام ہوا ہے کہ اقبالیات کو بھی مات کر گیا ہے۔ پاک و ہند کے سارے ادبی پرچوں نے غالب نمبر شائع

کئے ہیں، مذاکرے اور مباحثے منعقد ہوئے ہیں، تصنیفاتِ غالب کے ایک دو نہیں درجنوں اڈیشن شائع ہوئے ہیں، خود غالب اور کلام غالب سے متعلق سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں مقالات لکھے گئے ہیں۔ یہ تو پچھلے دو سال میں ہوا ہے، اس سے پہلے ۔ ۔ ۔ سال میں غالبیات کے سلسلہ میں کتنا کام ہو چکا ہے، اور اُس کی کیا نوعیت ہے، اس کا اندازہ کر لینا عام کیا خاص آدمیوں کی بھی بس کی بات نہیں تھی، اس سارے کام کے معیار و مقدار کو یکجا کرنے اور اسے کتابی صورت میں آئینہ دکھانے کے لئے ایک پورے ادارے کی ضرورت تھی لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس دیو قامت کام کو پروفیسر سید معین الرحمٰن نے تن تنہا انجام دے دیا اور اتنی جامعیت و خوش اسلوبی کے ساتھ کہ اس سے بہتر کی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔

''اشاریۂ غالب'' کی نوعیت کا کام پاک و ہند میں بعض دوسرے افراد نے بھی کیا ہے، لیکن صرف یہی نہیں کہ دوسروں کا کام، غالبیات کا پورا احاطہ نہیں کرتا بلکہ نوعیت و حیثیت کے لحاظ سے بھی کم رتبہ ہے اور تحقیق و تنقید کے سلسلہ میں اُس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، سیّد معین الرحمٰن کے کام، یوں بہت اہم ہے کہ تحقیق کی وقتِ نظری اور تنقید کی ژرف نگاہی، دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ ہر مضمون، ہر کتاب اور ہر رسالہ، پر براہِ راست نظر ڈالنے اور اس کی اشاعت کی ضروری تفصیلات دینے کے بعد اس کا ملخص بھی دے دیا گیا ہے، یہ ملخص اس نوع کا ہے کہ قاری کو اصل کام کے مطالعے سے بڑی حد تک بے نیاز کر دیتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے غالبیات کے سلسلے کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے۔ آج تک غالب کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ سب اس کتاب میں بالاختصار آ گیا ہے اور غالبؔ سے متعلق ہر قسم کی معلومات اس میں دستیاب ہو جاتی ہے۔ کتاب تین جلدوں میں تیار کی گئی ہے، جس کی پہلی جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ یقین ہے کہ غالبؔ کے سلسلے میں اس کتاب کے ذریعہ تحقیق و تنقید کا ایک نیا باب کھلے گا اور غالب کے نام اور کام کو اور اونچا کرے گا۔

(نگار، ستمبر ۱۹۷۰ء)

غالبؔ سے متعلق کتب اور مصنفین کا تعارف

مولانا حامد حسنؔ قادری مرحوم اور غالبؔ شناسی

اب سے کوئی سولہ سترہ سال پہلے کی بات ہے ’’رقیب‘‘ کے معنی دیکھ رہا تھا، کسی لغت میں تھا ،محافظ ونگراں، کسی میں ’’پاسبان ومنتظراور کسی میں ’دشمن ومدمقابل، ایک ہی لفظ کے معنی میں یہ تضاد کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں نے غائبانہ عقیدت کی بناپر مولانا سے رجوع کیا آپ نے جواب میں لکھا:

> ’’رقیب کے اصل معنی، محافظ ونگہبان ومنتظر ہی کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نام رقیب ہے، اللہ نے اپنے کو رقیب کہا ہے، پیغمبر صاحب کو رقیب کہا ہے، قرآن میں کئی جگہ رقیب کا لفظ آیا ہے، جیسے ’’ان اللہ علی کل شی ء رقیبا‘‘ لیکن عاشق کا رقیب عربی میں نہیں ہے۔ اردو میں ہے، مگر بے سبب نہیں، رقیب وہ شخص بھی ہوا جو دیکھتا اور تاکتا رہتا ہو کہ کوئی کیا کر رہا ہے، محبت کے رقیب بھی یہی کام کرتے ہیں اس لئے اردو میں رقیب کے معنی بہت مختلف ہو گئے۔‘‘

اسی طرح ایک خط میں، میں نے پوچھا ’’یہ کیا بات ہے کہ بعض خط وخال یا خال وخط لکھتے ہیں اور بعض خال وخد یا خدوخال کیا دونوں طرح درست ہے جواب آیا:

> ’’خط وخال یا خال وخط ہی درست ہے، خدوخال یا خال وخد غلط، اردو اور فارسی میں یہ محاورہ حلیہ وہیئت اور آرائش وزیبائش کے معنوں میں آتا ہے۔ فارسی شعراء نے خط وخال ہی ہمیشہ استعمال کیا ہے، خدوخال کی، کوئی مثال نہیں ملتی، اردو میں یہ غلطی انقلاب پسندوں کے ہاتھوں آتی ہے۔ جوشؔ صاحب کا شعر ہے:
>
> خال وخد سے جذبہ ہائے ضعف نازک آشکار

کرزنی چہروں پہ زن بننے کے ارماں بے قرار

لیکن عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، میں نے نقد و نظر کے کسی مضمون میں اس محاورہ پر
تفصیل سے بحث کی ہے، دیکھ لیجئے۔''

یہ ایک اجنبی کے خطوں کے جوابات تھے لیکن حد درجہ شافی محبت آمیز، دل خوش کن، چنانچہ اس کے بعد جب کبھی اس قسم کی اُلجھن سامنے آتی، مولانا کو لکھتا، مولانا بلا تاخیر جواب لکھ بھیجتے اور دعائیں اوپر سے دیتے، پھر یہ سلسلہ رسمی سے غیر رسمی بن گیا اور برسوں جاری رہا۔ مولانا کے کراچی آجانے کے بعد، مراسلے کا سلسلہ بند ہوا تو خوش قسمتی سے مکالمہ و ملاقات کی صورت نکل آئی۔ چنانچہ کراچی میں ان سے ایک بار نہیں بار بار مل کر جی خوش کیا اور کچھ نہ کچھ لے کر اُٹھا۔

مولانا حامد حسن قادری اردو کے معلم و ادیب تھے، محقق و نقاد تھے، مورخ و تاریخ گو تھے، شاعر اور علم عروض و بدیع کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اردو سب پر یکساں دسترس رکھتے تھے، مجھے پرچے کا نام یاد نہیں آرہا، لیکن مولانا خود کہا کرتے تھے کہ میری اوّلین تحریر ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں پنجاب کے کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی، اس طرح کم و بیش ساٹھ سال، انھوں نے اردو کی خدمت میں صرف کئے تھے۔ ''بقامت کہتر'' تھے لیکن بہ قیمت بڑے بڑوں سے بہتر تھے۔ ظاہر ہے ایسی باکمال اور جامع الصفات شخصیت کے علمی و ادبی کارناموں سے بحث کرنا میرا منصب نہیں اس کا حق دراصل دوسرے بزرگوں کو پہنچتا ہے، پھر بھی اگر ان کے بارے میں مجھے کچھ کہنا ہی ہے، مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ اپنی علمی و ادبی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھے آدمی بھی تھے، کتنے اچھے، اتنے اچھے کہ اب ایسے لوگ کم ہیں۔ مثال ہی چاہتے ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ اتنے اچھے جتنے مولانا حالی تھے، آپ کہیں گے کہ مولانا حالی کتنے اچھے تھے؟ کم از کم اتنے اچھے ضرور تھے جتنے مولوی عبدالحق صاحب ظاہر کر گئے ہیں۔ مولانا حالی کو میں نے نہیں دیکھا اور میری عمر کے کسی آدمی نے نہیں دیکھا۔ پھر بھی جس نے مولانا قادری کو دیکھا ہے گویا مولانا حالی کو دیکھا ہے۔ وہی سادگی و شرافت، وہی نیک نفسی و خدا ترسی، وہی خوش خلقی و انکسار، وہی دردمندی و انسان دوستی، وہی شغف وملی شعور، وہی دل نوازی و خوش مزاجی، وہی اصلاحی نقطۂ نظر و تعمیری طرز فکر، جو حالی کے ہاں ملے گی۔ مولانا میں نظر آتی ہے اسی لئے جب کبھی ان سے ملا حالی کا یہ شعر بے ساختہ یاد آیا اور میں نے حالی کی جگہ حامد پڑھا۔

بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولانا قادری بھی، مولانا حالی کی طرح، لباس پوشاک، وضع قطع، سوچ بچار اور خیالات و افکار کے لحاظ سے مذہبی آدمی تھے۔ سلسلۂ قادریہ سے بیعت تھے، اپنے عقائد میں پختہ تھے، ارکانِ شریعت کے سختی سے پابند تھے۔ علوم اسلامی، تصوف اور قرآن وحدیث سے انہیں گہری واقفیت و دلچسپی تھی نہ صرف دلچسپی بلکہ فطری لگاؤ تھا بایں ہمہ مولانا میں مذہبی تعصب وخشونت یا مولویانہ مزاج کی خشکی وتنگ نظری نام کو نہ تھی، کہا کرتے تھے کہ مذہب دلوں کو توڑنے کے لئے نہیں دلوں کو جوڑنے کے لئے آیا ہے۔ علم وادب کے باب میں تو علاقائی تعصبات وطبقاتی مفادات اور مذہبی امتیازات سے یکسر پاک تھے، کسی فن کار کے عقائد اور اطوار واشغال سے بھی وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوتے تھے، صرف اس کے فن کو سامنے رکھ کر اس کے مرتبہ کا تعین کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا کسی تقریر وتحریر سے ناک بھوں چڑھانے کے بجائے اس سے لطف اندوزی کا پہلو نکال لیتے تھے، ان کی خوش ذوقی اور ظرافت پسند طبیعت کا اندازہ اس لطیفہ سے کیجئے جو انھوں نے خود ایک جگہ تحریر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''کسی صحبت میں ایک صاحب نے خواجہ حافظ شیرازی کے اس شعر کی تشریح فرمائی

گناہ گرچہ نہ بود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش وگو گناہِ من است

فرمایا کہ یہ بندے اور خدا کے درمیان مکالمہ ہے اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے:

بندہ: گناہ گر! (یعنی اے گناہ گر، گناہ کو پیدا کرنے والے،

خدا: چہ! (کیا ہے اے بندے)

بندہ: نہ بود اختیار (یعنی قعر عصیاں میں گر پڑے تو اس میں کچھ ہمارا اختیار نہیں)

خدا: ما حافظ: (ہم بچانے والے ہیں تو کچھ اندیشہ نہ کر)

مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ یہ سن کر میں لاحول پڑھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہ دوسرے مصرع میں خدا جانے کیا گل کھلائیں گے۔ وہ شاید مولانا ٹائپ ہوں گے، ہم ہوتے تو دوسرے مصرع کی شرح بھی ضرور سنتے، ظرافت تھی تو دلچسپ اور حماقت تھی تو

عجیب اور اگر ان مولانا کو جلسے سے اُٹھانے کی تدبیر تھی تو لاجواب۔‘‘
(نقد و نظر، ص ۴۸)

غرض کہ مولانا بڑے خوش طبع، کشادہ قلب اور وسیع النظر تھے۔ ان کی ادبی تحریروں خصوصاً داستان تاریخ اردو پر نظر ڈالئے، اس میں مولانا نے ہندو مسلمان اور عیسائی ہر مذہب کے بے شمار ادیبوں اور ان کی تصانیف پر اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا ہے، آپ کہیں کہیں اس سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ بعض غلط واقعات یا سنین کے اندراج کی نشان دہی کر سکتے ہیں لیکن طرف داری و تعصب یا کسی کی دلآزاری و تنقیص کی ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتے۔

مولانا قادری غالب کے شاگرد نہ تھے لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ بہت سی باتوں میں غالب کے شاگرد خاص مولانا حالی سے ملتے جلتے تھے شاید یہ وجہ ہو کہ مولانا حالی اور مولانا حامد دونوں ہم وزن ہیں۔ ان تخلصوں میں عجب مشابہت ہے، بلکہ مشابہت کیوں، علم بدیع کی زبان میں صنعت تجنیس خطی ہے اور اس لئے غالب کے باب میں یہ دونوں ہم خیال تھے۔ استاد شہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور ان کے شاگرد محمد حسین آزادؔ کی بدولت، ایک مدت تک جن ناقدر دانیوں کا شکار ہوئے اس کا احساس حالیؔ اور مولانا قادری دونوں کو تھا۔ حق یہ ہے کہ اگر مولانا حالیؔ 'یادگارِ غالب' نہ لکھ جاتے تو شاید ''شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن'' کی تعبیر ابھی کچھ دنوں اور نظر نہ آتی۔ بیسویں صدی کے ادیبوں کو غالب شناسی کا جو دعویٰ ہے اسے حالیؔ کی 'یادگارِ غالب' کا فیضان خیال کرنا چاہیے۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مولانا قادری، غالب سے مولانا حالی ہی جیسی ارادت مندی رکھتے تھے، غالب کا نام کیا آتا گویا جام آ جاتا اور ان کے ہاتھ کی سب لکیریں رگِ جان بن جاتیں۔ غالب کی طرف سے زمانے کی بے مہری پر اکثر اظہارِ افسوس کرتے اور مرزا کا یہ شعر پڑھتے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

ایک دن باتوں باتوں میں ذکر فرمانے لگے کہ میں ایک زمانے میں غالب پر ایک مضمون انگریزی میں "The licasing Poet" کے عنوان سے لکھنا چاہتا تھا تا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ طبقہ ان کی طرف متوجہ ہو۔ میں نے ان کی اس بات کو اس وقت کچھ زیادہ اہمیت نہ دی

اس لئے کہ غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب رسالہ نقاد ۱۴-۱۹۱۳ء کے بعض پرچے میری نظر سے گزرے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی یہ ارادہ مولانا کے تحریری صورت میں ۱۹۱۳ء میں اس وقت ظاہر کیا تھا جبکہ 'یادگارِ غالب' کے سوا، اردو انگریزی میں کوئی کتاب یا مقالہ وجود میں نہ آیا تھا۔

مولانا کی بعض قدیم تحریروں سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے کسی زمانے میں غالب کے اردو فارسی دیوان سے اشعار بھی انتخاب کئے تھے، معلوم نہیں یہ منتخبات اب بھی محفوظ ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو بڑے کام کے ہیں انھیں منظر عام پر لانا چاہئے اس لئے کہ مولانا نے یہ انتخاب دیوانِ غالب کے اس نسخے سے کیا تھا جو ۱۸۶۴ء میں غالب کی وفات سے پانچ سال پہلے شائع ہوا اور جس کے پروف بقول مولانا حامد حسن قادری خود غالب نے پڑھے تھے۔ مولانا قادری نے انتخاب دیوانِ غالب کا انتساب بھی غالب ہی کے نام کیا تھا۔ یہ انتساب منظوم تھا اور اس بحر و وزن میں تھا جس میں علامہ اقبال نے غالب پر نظم کہی یعنی "ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا" منظوم انتساب اگست ۱۹۱۴ء کے نقاد میں شائع ہوا ہے، چند اشعار سن لیجئے۔

اے لسانِ اہلِ درد اے غالبِ شیوا بیاں — اے کہ ہر ہر مصرع ترا آہِ دلِ تفتہ دلاں
ایشیائی شاعری کی جان ہے دیواں ترا — تو پیمبر ہے ترا قرآن ہے دیوان ترا
تیرا دیواں جذبۂ عشاق کی تصویر ہے — مصحفِ دردِ نہاں کی پُر الم تفسیر ہے
ہر غزل تیری شرابِ درد کا پیمانہ ہے — میکشانِ عشق کو دیواں ترا مے خانہ ہے
تیرے خم خانے کا غالبؔ جرعہ کش حامدؔ بھی ہے — تیرے مینائے سخن کا درد چش حامدؔ بھی ہے
تیرے دیواں سے کئے ہیں چند اشعار انتخاب — تیری روحِ پاک سے کرتا ہوں ان کا انتساب
ایں بیاضم کہ دست از درہائے اشعارت صدف — در حضورت گر قبول افتد زہے عز و شرف

غالب شناسی کے سلسلہ میں ان کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ شاہ دلگیر نے دیوانِ غالب کی اشاعت کے خیال سے ایک دیباچہ کا اشتہار دیا اور اس وقت کے سارے ممتاز اہلِ قلم کو دعوتِ فکر دی۔ بعد کے پرچے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ مولانا یہ اشتہار دیکھ کر باغ باغ ہو گئے تھے۔ صرف اس امید پر کہ اس طرح دیوانِ غالب کا ایک خوبصورت اڈیشن دیکھنے کو مل جائے گا، لیکن جب کئی مہینے گزر گئے اور دیوان نہ آیا تو مولانا سے نہ رہا گیا اور انھوں نے دلگیر کو ایک طویل خط لکھ

بھیجا۔ یہ خط بھی اگست ۱۹۱۴ء کے 'نقاد' میں شائع ہوا ہے، اس کی صرف چند سطریں دیکھئے:

''شعر و سخن کی کتابوں میں سے تو دیوانِ غالب کے سوا کچھ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا اور اس کا دیوان ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں خدا جانے اس ''چار جزو'' کی کتاب میں کیا مزا ہے اتنی مرتبہ دیکھا ہے کہ سب دیوان نہیں تو سینکڑوں شعر حفظ ہو گئے ہیں مگر جب دیکھتا ہوں نیا لطف پاتا ہوں۔ آج کالج کی لائبریری سے 'یادگارِ غالب' لے آیا اس وقت دیکھ رہا تھا دیکھتے دیکھتے وہی خواہش کہ کسی طرح دیوانِ غالب کا بہترین اڈیشن شائع ہوا، دل میں پیدا ہوئی، اسی کے ساتھ آپ کا وعدہ اور دیباچہ کا اشتہار یاد آیا۔۔۔ کوئی دیباچہ وصول ہوا یا نہیں۔۔۔ اور اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ خدا کے لئے جلد اشاعت کی صورت کیجئے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا میرا ارادہ دیباچہ لکھنے کا ہے، اگر میں اپنے کو اس قابل سمجھتا تو آپ کے اشتہار وارادہ سے پہلے لکھ کر شائع کر دیتا کیوں کہ برسوں سے میں اسی تمنا میں ہوں۔ اگر خدانخواستہ اب تک کوئی عمدہ دیباچہ وصول نہ ہوا ہو تو آپ خود قلم اٹھایئے، اور آپ سے بہتر میں نیاز کو سمجھتا ہوں وہ یہ تکلیف گوارا کر لیں تو بیڑا پار ہے۔''

اس عبارت سے اندازہ کیجئے کہ وہ غالب اور ان کے دیوان کے بارے میں کیا کیا آرزوئیں اور خواہش رکھتے تھے۔ غالب اور کلامِ غالب سے انھیں کتنا لگاؤ تھا اس کا اندازہ ایک اور بات سے بھی ہوتا ہے، مولانا حامد حسن قادری نے باقاعدہ شاعر بننے کی کوشش کبھی نہیں کی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ شاعری کا جوہر فطری لے کر آئے تھے، شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے، شعر گوئی میں ان کی زیادہ توجہ، رباعی، تضمین اور تاریخ گوئی کی طرف رہی ہے۔ تاریخ گوئی میں انھیں جو کمال حاصل تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ رباعی کے سلسلے میں شاید کم لوگوں کو علم ہو کہ ایک زمانے میں ان کی رباعیاں رسالہ ''عالمگیر'' میں مسلسل شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے مولانا ابوسعید ابوالخیر کی فارسی، رباعیوں اور باباطاہر عریاں کی دوبیتیوں کو بھی اردو رباعی میں منتقل کیا تھا۔ مجھے مولانا نے یہ قلمی بیاض پڑھنے کو دی تھی خوبصورت جلد اور سنہرا حاشیہ تھا، اور مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ اس کی ابتداء میں ایک منظوم دیباچہ تھا اور وہ بھی رباعیات کی صورت میں۔

رباعی اور تاریخ گوئی کے بعد انھوں نے زیادہ توجہ نظموں پر صرف کی ہے اور اردو فارسی کے بہت سے اساتذہ کے مصرعوں پر مصرعے لگائے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں صرف ایک مثال سے ان کی جدتِ طبع اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا نے شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ قطعہ 'بلغ العلا بکمالہٗ' پر مصرعے لگائے ہیں اور یہ التزام کیا ہے کہ اردو کے قافیے، عربی قافیوں کے بالکل مشابہ اور ہم آواز ہوں، غور کیجئے کہ جمالہٗ اور کمالہٗ کے طرز پر اردو کے قافیے لانا آسان نہیں لیکن اس منزل سے آسان گزر گئے ہیں، آپ بھی مولانا کے مصرعے سن لیجئے۔

انھیں دل جو کر دیں حوالے ہی　　تو کرم پھر ان کا سنبھالے ہی
انھیں جانیں جاننے والے ہی　　کہ ہیں وصف ان کے نرالے ہی
بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ　　کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیعُ خِصَالِہٖ　　صَلُّوا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

لیکن تضمین نگاری کے محبوب مشغلے میں بھی ان کی زیادہ توجہ غالب کی طرف رہی ہے اور مولانا نے غالب کی بعض پوری پوری غزلوں کی تضمین کی ہے، ایک ایک مصرع نہیں بلکہ تین تین مصرعے لگائے ہیں اور خمسہ کہا ہے، صرف ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

درد منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مولانا فرماتے ہیں:

نام بدنام عشق کا نہ ہوا　　میں بھی شرمندۂ وفا نہ ہوا
یہ بُرا کیوں ہوا بھلا نہ ہوا　　درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

غالب کا شعر:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

مولانا کی تضمین:

اتنے بے درد بھی نہ بن جاؤ　　کہ غرض کچھ بُرے بھلے سے نہ ہو
ہے یہ آپس کی بات سوچو تو　　جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

غالب کا شعر:

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

مولانا کی تضمین:

ہم نے کی فکر جب بلانے کی　　　اُن کو سوجھی کسی بہانے کی
اب سنی ہے جو گھر لٹانے کی　　　ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کلامِ غالب کے سلسلے میں تضمین کا یہ شوق، مولانا کو شروع ہی سے تھا۔ ایک زمانے میں انھوں نے اس سلسلے میں یہ جدت کی تھی کہ غالب کے کسی شعر پر مسلسل غزل کے طور پر متعدد مصرعے یا اشعار لگاتے تھے اور یہ اشعار غالب کے زیرِ تضمین شعر کی مکمل تشریح و تفسیر بن جاتے تھے، میرے پاس ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء کے نقاد کی دو فائلیں ہیں ان میں مولانا کی دوسری نظموں اور انشائیوں کے ساتھ اس قسم کی متعدد تضمین بھی ہیں، بطور نمونہ صرف ایک تضمین کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

غالب کا مشہور شعر ہے

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال　　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مولانا نے پہلے مصرعے کو ''طرح'' اور محشر کو قافیہ خیال کر کے لکھا ہے کہ:

شاعر ہیں ہم چلیں گے اسی شاہراہ پر　　　لے جائے گا جدھر کو ہمیں رہبر خیال
ہم شیخ ہیں تو حاجتِ مسجد نہیں ہمیں　　　ہے اپنے ساتھ واعظِ دل منبر خیال
ہم بُت پرست ہیں تو کیوں جائیں دیر کو　　　پہلو میں اپنے رکھتے ہیں ہم کافر خیال
ہم بوالہوس نہیں ہیں پرستارِ حُسن ہیں　　　معشوق ہے ہمارے لئے دلبر خیال
تم ہو کہ دل نہیں ہے تصور سے آشنا　　　ہم خوگرِ خیال ہیں ہم پیکر خیال
ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

('نقاد' بابت جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۴۶)

کلام غالب پر مولانا کی یہ تضمین آج کچھ زیادہ اہم نہ سہی لیکن اب سے پچاس برس پہلے یہ بہت مقبول و پسندِ خاطر تھیں اور 'یادگارِ غالب' 'محاسنِ کلامِ غالب' کے درمیانی عہد میں وہ غالب شناسی اور غالب فہمی کا موثر ذریعہ خیال کی جاتی تھیں چنانچہ اسی قسم کی ایک تضمین پر شاہ مدیر ''نقاد''،

نے مئی ۱۹۱۴ء کے پرچہ میں حسب ذیل نوٹ شائع کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

> ''مولوی حامد حسن قادری بچھرایونی نے مرزا نوشہ غالب کے اشعار لطیف پر تضمین کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ نہایت پُر لطف اور کام کی چیز ہے۔ یہ گویا اصل شعر کی منظوم شرح ہے جس کے ذریعہ اس کے تمام محاسن و مطالب بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور اس دل نشیں طریقہ سے کہ دماغ پر فکر کا بار بالکل نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے دوست نے اسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھا اور کافی اشعار کی تضمین کر دیں تو وہ ہماری شاعری میں ایک مفید و دلچسپ اضافہ ہوگا۔''

قادری صاحب مرحوم کی غالب شناسی کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی حیات میں غالب اور غالبیات پر جو کچھ لکھا گیا تھا سب ان کی نظر سے گزرا تھا، کلام غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں سب کا انھوں نے غائر مطالعہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ شوکت تھانوی کی مزاحیہ شرح دیوانِ غالب کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا اور ہر شرح کے عیوب و محاسن پر مفصل بحثیں کی ہیں۔ یہ بحثیں مضامین کی صورت میں ان کی تصنیف نقد و نظر میں محفوظ ہیں، اور غالب کے متعلق ان غلط فہمیوں اور غلط اندیشیوں کا ازالہ کرتی ہیں جو مختلف شارحین نے پیدا کر دی ہیں، افسوس کہ مولانا نے، غالب پر اتنا کچھ نہ لکھا جتنا وہ انھیں جانتے تھے، ہاں جو کچھ ان پر لکھا جاتا تھا برابر اس کے دیکھنے کی فکر میں رہتے تھے اور جہاں کسی سے کوئی چوک ہوتی جب تک اس کی تصحیح نہ کر دیتے ان کی طبعت کو چین نہ آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غالبیات کے سلسلے میں ان کی یہ تحریریں جو کہ ہر قدم پر رہنمائی کا کام کرتی ہیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی اس غالب شناسی یا غالب دوستی ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ غالب کے طرف دار تھے۔ ایسا نہیں ہے سخن فہم پہلے تھے، طرفدار بعد کو، انھوں نے کلامِ غالب پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور بعض مضامین میں ان کی کمزوریاں ظاہر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ زبان و معنی اور عروض و بیان ہر قسم کے عیوب انھوں نے غالب کے یہاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور اس کے بعد انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ''میں اس کو قدیم غزل کا مجدد اور جدید غزل کا محسن مانتا ہوں، غالب نے اپنے دیوان فارسی کو 'دین سخن' کی ایزدی کتاب کہا ہے میں اس قول کو اردو دیوان کے حق میں بھی درست سمجھتا ہوں۔''

(نگار، نومبر ۱۹۶۶ء)

دیوانِ غالبؔ۔نسخۂ خواجہ
اورڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

غالبؔ نے جب اپنے بارے میں اس طرح کی باتیں کہی تھیں کہ:

بیا آیورید گراین جا بود زبان دانے
غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی دارد

یا

ہوں گرمیٔ نشاطِ تخیّل سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

یا

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

تو بہتوں نے غالب کے اس نوع کے بیانات کو غلو اور تعلّیٔ محض سے تعبیر کیا تھا لیکن آخر آخر سب کو تسلیم کرنا پڑا کہ غالب کے ادعات و بیانات، کسی مبالغۂ شاعرانہ یا تفاخرِ بے جا پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہیں۔ طرفدارانِ غالب سے لے کر حریفانِ غالب تک سب نے اپنی تحریروں سے اس بات کی شہادت دی کہ غالب فی الواقع ایک نابغۂ فن ہے اور اردو شاعری میں بعض کے نزدیک اس سے بڑے اور برتر شاعر تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کا مثیل و نظیر کوئی نہیں ہے غالب کی اس حیثیت کو منوانے میں دس بیس برس نہیں کم و بیش ڈیڑھ سو سال بیت گئے۔ غالب نے اپنے پر اہلِ دہر کا قیاس کر کے فنِ شاعری کے بارے میں یہ حکم تو لگا دیا کہ

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہُوا

لیکن جس طرح وہ قطرے میں دجلہ دیکھ رہے تھے اور جزو میں کل کا مشاہدہ کر رہے تھے، اسے اوروں کو دکھانا اور مشاہدہ کرانا بہت مشکل ہو گیا۔ اس کے لیے پہلے خود انھیں اپنے بعض اشعار و تلمیحات کی تشریح و توضیح کرنی پڑی اور لفظ و معنی کے پیچ در پیچ اور تہہ بہ تہہ رشتوں کو سمجھنا پڑا، پھر اللہ نے ان کے ارادت مند و شریف النفس، شاعر و ناقد مولانا الطاف حسین حالؔی کو وہ توفیق بخشی کہ انھوں نے ''یادگارِ غالب'' کے ذریعے، اپنے ہم عصر نامور سخن شناس، و انشاء پرداز محمد حسین آزادؔ کی ان جملہ زیادتیوں کا حساب چکا دیا جو موصوف نے اپنے استاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کو آگے بڑھانے کے لیے غالب کے ساتھ کی تھیں۔

اس طرح غالب کی قدر شناسی کا راستہ ہمیشہ کے لیے صاف و ہموار ہو گیا۔ افکارِ تازہ سے آراستہ اور علومِ جدیدہ سے مسلّح غالب شناسوں کا ایک پورا قافلہ تیزی سے اس راہ پر چل نکلا اور بیسویں صدی تو پوری صدی غالب کے فکر و فن کی تحقیق و تنقید کے لیے وقف ہو گئی۔ پہلے مفتی انوار الحق، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، مالک رام اور ڈاکٹر نذیر احمد جیسے بزرگوں نے اس طرف توجہ کی پھر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، کالی داس گپتا رضا، مشفق خواجہ، آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن جیسے قدرے جواں سال اہلِ فکر و نظر سامنے آ گئے اور ان سب کی کوششوں کے نتیجے میں یہ ہوا کہ غالب کا نام جو اس سے پہلے صرف خاص الخاص حد تک محدود تھا حلقۂ خاص سے نکل کر حلقۂ عام کے باذوق لوگوں تک پہنچ گیا۔

غالب فہمی و غالب آشنائی کی اس توسیع میں جیسا کہ عرض کیا گیا ایک دو نہیں درجنوں بالغ نظر اہلِ قلم نے حصہ لیا لیکن مجھے کہنے کی اجازت دیجیے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ رواں صدی کی آخری تین دہائیوں یعنی گزشتہ تیس برسوں میں جس تواتر و تسلسل، جس انہماک و اغراق جس مستقل مزاجی و خرد بینی، جس مطالعاتی وسعت و تنقیدی بصیرت اور حسنِ خیال و عمل کے ساتھ، ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے کام کیا ہے ان کے کسی دوسرے ہم عمر ہم عصر نے نہیں کیا ہر چند کہ غالب اور غالبیات کے تعلق سے ان کی مطبوعات کی تعداد خاصی ہو چکی ہے۔ پھر بھی ان کے کام کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی چنانچہ اگر صرف ان کے مطبوعہ کام ہی کو نظر میں رکھیں تو کہنا پڑے گا

کہ غالب اور کلامِ غالب کی تحقیق وتنقید اور ترجمہ تدوین کے باب میں نہ صرف یہ کہ ان کا کام بہ لحاظِ مقدار و تعداد دوسروں سے زیادہ ہے بلکہ نقد و نظر کے متداول میزان و معیار پر بھی پورا اُترتا ہے۔

غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کا پہلا قابلِ توجہ کام ''اشاریۂ غالب'' ہے۔ یہ کام پہلی بار ۱۹۶۹ء میں بصورتِ کتاب، منظرِ عام پر آیا اور غالب کے بارے میں اپنی نوعیت کا پہلا قابلِ قدر کام ہونے کے سبب سارے علمی و ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ ''اشاریۂ غالب'' کے سامنے آنے سے یہ ہوا کہ ۱۹۷۰ء تک غالب کے کلام و نثر کے جتنے مجموعے اور ان مجموعوں کے جتنے اڈیشن شائع ہوئے تھے، وہ سب کے سب بہ یک وقت سامنے آگئے اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے ادب کے قارئین با آسانی ایک ایسے خزینۂ بیش بہا سے متعارف ہو گئے جو ''اشاریۂ غالب'' کے سوا، کسی اور طرح ممکن نہ تھا، اس سے ایک طرف تو یہ ہوا کہ ادب کے عام قاری کو غالب اور غالبیات کے ماخذ تک رسائی حاصل ہوگئی، معلومات میں خوش آئند اضافہ ہوا، افادے کی آسان صورت نکل آئی، ذہن میں کلبلاتے ہوئے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی راہ ہموار ہوگئی اور غالب و غالبیات پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں میں ایک نئی لگن نئی جستجو، نیا ذوق و شوق اور تازہ ولولہ و حوصلہ پیدا ہوا۔ نیز اس خوف و خیال سے کہ غالبیات سے متعلق ساری اہم اطلاعات ''اشاریۂ غالب'' کے ذریعے سب کے سامنے موجود ہیں، ان میں تحقیقی وتنقیدی کاموں کی فیصلہ سازی میں مزید احتیاط، توجہ، جانچ پڑتال اور پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھانے کی عادت راسخ ہوئی۔ گویا معین الرحمٰن نے ''اشاریۂ غالب'' کے ذریعے غالب کے طرف داروں اور غالب کے سخن فہموں دونوں کے لیے تحقیق وتنقید کی ایک ایک نئی راہ کھول دی، ایسی راہ جس کے بغیر غلط روی اور گم رہی کا خطرہ بہر حال لاحق رہتا تھا۔

ایک ''اشاریۂ غالب'' پر کیا موقوف ہے غالب سے متعلق معین الرحمٰن کی متعدد مطبوعات میں سے کئی ایسی ہیں جو تحقیق وتنقید، دونوں راہوں سے مطالعۂ غالب کے سلسلے میں ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس جگہ ان کا مختصر سے مختصر ذکر بھی ممکن نہیں البتہ ''غالب اور انقلاب ستاون'' نامی کتاب کا چند سطری ذکر بہر حال کروں گا۔ یہ کتاب صرف یہی نہیں کہ ۱۹۷۴ء میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے داؤد ادبی انعام کی مستحق قرار پائی بلکہ اس نے معین الرحمٰن کے نام اور کام کو غالبیات کے سلسلے میں مستقلاً معتبر و مستحکم کر دیا۔ اس کتاب کے مندرجات کے سامنے آنے سے قبل تک غالب کے بعض ناقدین سخت گم رہی و غلط فہمی کا شکار تھے چنانچہ جہاں جہاں غالب کے اشعار میں

ظلم وستم، رنج وغم، زمانے کی ستم شعاری، وقت کی ناہنجاری، ناداری و بے روزگاری اور عسرت و بے سروسامانی کا ذکر ہوتا تھا، ہمارے بعض ناقدین ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی ہنگامہ آرائی وتباہ کاری سے منسلک کر کے غالب کے ذہن پر ہنگامۂ غدر کے اثرات کا نتیجہ ثابت کر دیتے تھے۔ معین الرحمٰن نے اس غلط فہمی و کج بینی کو اپنی کتاب میں معقول دلائل وشواہد سے رد کیا اور یہ انکشاف کیا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زیر اثر غالب کا ذہن اتنا بجھ گیا تھا کہ انھوں نے غدر کے بعد سے لے کر اپنی وفات ۱۸۶۹ء تک کی درمیانی مدت میں تقریباً شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ ان کے کلام کی توقیت بتاتی ہے کہ اس دس بارہ سال کے عرصے میں انھوں نے کم سے کم اشعار کہے اور شعر گوئی کے بدلے خطوط نویسی کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ ظاہر ہے اس انکشافِ تازہ نے علمی و ادبی حلقوں کو چونکایا، اپنی طرف متوجہ کیا، محققین و ناقدین غالب کو غور وفکر کے لیے ایک نیا موڑ دیا اور غالب کے حالات وکلام کو نئے رُخ سے دیکھنے دکھانے پر مجبور کیا۔

غالب کے سلسلے میں اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف کی تحقیقی کاوشوں کی بدولت پہلی بار سامنے آئی ہیں چنانچہ اگر غالب کے سلسلے کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے معین الرحمٰن کی اوّلیات گنوائی جائیں تو ان کی تعداد درجنوں تک پہنچے گی۔ سب سے نمایاں اور اہم بات تو اس سلسلے میں یہی ہے کہ معین الرحمٰن پہلے پاکستانی ادیب ہیں جنھوں نے غالب جیسے نابغۂ روزگار اور بحرِ زخّار کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا اور پی ایچ ڈی کی سند لی اور پی ایچ ڈی کے بعد بھی غالب ہی کے تعلق سے انھوں نے اتنا وافر و قیع کام کیا اور ایسی بلند سطح سے کیا کہ انھیں کسی جامعہ سے ڈی لٹ کی رسمی سند دی جائے یا نہ دی جائے، لیکن میں جانتا ہوں اور پوری دیانت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت اردو کے چند گنے چنے معتبر غالب شناسوں کی صف میں شامل ہیں اور انھوں نے جو کام کیا ہے وہ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد و منازل سے بہت آگے کی چیز ہے۔

بسلسلہ غالب، معین الرحمٰن کے امتیازات میں اس بات کو بھی شامل کرنا چاہیے کہ عصرِ حاضر کے غالب شناسوں میں یا غالب کے قابلِ ذکر ناقدوں اور محققوں میں وہ سب سے کم عمر ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے باب میں آج بھی ان کا قلم ان سے بھی زیادہ توانا ہے اور غالب وکلامِ غالب کو مسلسل اپنی جولاں گاہ بنائے ہوئے ہے۔ اس جولانی کی تازہ ترین مثال ''دیوانِ غالب'' کا وہ نادر ونایاب خطی نسخہ ہے جو ''نسخۂ خواجہ'' سے موسوم ہو کر مکتبۂ اعجاز، سمن آباد

لاہور سے ۱۹۹۸ء میں منظرِ عام پر آیا ہے اور اس اہتمام والتزام کے ساتھ آیا ہے کہ غالب کے طرفداروں اور خردہ گیروں، دونوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

آج سے کوئی پچیس سال پہلے کی بات ہے ''غالب اور انقلاب ستاون'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے ''نگار'' بابت جنوری، فروری ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا کہ ''غالب اور غالبیات'' پر ایک دو نہیں سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ لکھنے والے تھکتے ہیں نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غالب کا ہر بالغ نظر نقاد، اس کی شخصیت اور کلام سے کوئی نہ کوئی ایسا اچھوتا پہلو، اپنی گفتگو کے لیے نکال لیتا ہے کہ وہ علم و ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ کم از کم زیرِ نظر کتاب کی یہی صورت ہے۔ اس میں معین الرحمٰن نے غالب کی زندگی اور فکر و فن کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو ابھی تک غالب کے عام قاری ہی سے نہیں خاص سے بھی پوشیدہ تھیں۔

میرا یہ بیان من و عن ڈاکٹر معین الرحمٰن کی تازہ ترین کتاب ''دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ'' پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ یہ نسخۂ ادب کے قارئین کے لیے عموماً اور غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے خصوصاً ڈاکٹر معین الرحمٰن کی طرف سے اُسی نوع کا قیمتی تحفہ ہے، جس نوع کا تحفہ مفتی انوارالحق نے تقریباً آج سے اَسّی سال پہلے بھوپال میں دستیاب ''دیوانِ غالب'' کے خطی نسخے، نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے پیش کیا تھا اور جس کی اشاعت نے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔

''نسخۂ خواجہ'' بھی خطی ہے اگرچہ بخطِ غالب نہیں ہے لیکن اس کی افادیت و اہمیت ''نسخۂ حمیدیہ'' سے کم نہیں ہے اس لیے کہ ''نسخۂ خواجہ خطی'' کم و بیش غالب کا وہی دیوان متداول ہے جو پہلی بار ۱۸۴۱ء میں اور بعد ازاں متعدد بار غالب کی زندگی میں شائع ہوا اور خود غالب نے اسے مصدقہ و مستند ٹھہرایا۔ مرتب کے بقول ''زیرِ نظر نادر نسخۂ خواجہ کی ایک بڑی وجہ امتیاز یہ ہے کہ کتابت کے بعد یہ نسخہ غالب کے پاس اور ان کے پیشِ نظر رہا اور اسے انھوں نے شروع سے آخر تک دیکھ کر جہاں تہاں اپنے قلم سے تصحیح یا اضافہ کیا ہے'' اس اعتبار سے دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ خطی مرتبہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن، اُن سارے خطی نسخوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ معتبر و قابلِ استناد ہے جو اس سے پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے تعارفات کے ساتھ متعارف ہوئے ہیں۔

''نسخۂ خواجہ خطی'' جو ۱۹۸۱ء میں ایک پرانی کتابوں کی گشتی دکان سے معین الرحمٰن کے ہاتھ لگا اور جسے انھوں نے انگریزی زبان وادب کے پروفیسر اور غالب کے قدرداں مشہور اردو ادیب، خواجہ منظور حسین سے اپنی عقیدتِ خاص کی بنا پر ''نسخۂ خواجہ'' کا نام دیا ہے، ۱۸۵۲ء کا مکتوبہ ہے اور اس اعتبار سے نہایت اہم ومنفرد ہے کہ یہ ۱۸۴۷ء تا اگست ۱۸۵۲ء کے درمیان کہے گئے اشعار غالب کی تائید وتصدیق کرتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ غالب نے ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۲ء کے درمیانی چھ برسوں میں صرف چار سو اکتیس اشعار کہے ہیں اور ان اشعار میں غزل، قصیدہ، قطعہ اور رُباعی، چاروں اصناف کے شعر شامل ہیں۔ تحقیق کا کام کرنے والے اہلِ قلم خوب جانتے ہیں کہ کسی قدیم شاعر کے دو چار شعروں کے بارے میں بھی یہ سراغ لگانا کہ وہ کس سنہ میں یا کس زمانے میں کہے گئے ہیں کیسا مشکل کام ہے، نہ کہ غالب جیسے عظیم وقدیم شاعر جس کے کلام کے خطی ومطبوعہ نسخے درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، اس کے بارے میں وثوق سے یہ نشان دہی کرنا کہ زیرِ بحث چار سو اکتیس اشعار غالبؔ نے کب اور کن سنین کے درمیان کہے ہیں حد درجہ مشکل کام ہے۔ داد کے مستحق ہیں ڈاکٹر معین الرحمٰن کہ وہ اپنی انتھک محنت اور غیر معمولی توفیق تحقیق کی بدولت اس مشکل سے آسان گزر گئے ہیں۔

''دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ'' مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ایک عطا اردو والوں کے لیے یہ بھی ہے کہ غالب کے متداول دیوان کا جو ''دیباچہ'' اور ''خاتمہ'' پہلی اشاعت سے لے کر آج تک بزبانِ فارسی چلا آ رہا تھا اور جن کا سمجھنا ہمارے لیے آسان نہ تھا، ان کا اردو ترجمہ بھی زیرِ نظر ''نسخۂ خواجہ'' میں شامل ہے۔ بڑی تقطیع کے ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اپنی اصل خطّاطی سمیت پوری احتیاط والتزام اور اہتمامِ صحت وصفائی کے ساتھ دبیز قیمتی سفید کاغذ پر دیدہ زیب جلد اور نفیس طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے اور غالب کے دوسرے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر شاعر کی روح کے لیے اردو والوں کی طرف سے خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اور کچھ نہیں تو ہمیں اس عظیم کام پر کم از کم معین الرحمٰن صاحب کو ہدیۂ تبریک تو پیش کرنا چاہیے۔

''سخنے بیادِ غالبؔ'' از اطہر رضوی

سنہ ۱۹۹۵ء

غالبؔ، اردو کا ایک عجیب وغریب شاعر ہے، عجیب وغریب ان معنوں میں کہ نہ تو اس پر سوچنے والے تھکتے ہیں نہ لکھنے والے، نہ اس کے پڑھنے والوں میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے اور نہ اس کے کلام پر سر دھننے والوں میں بلکہ سلسلہ اس کے برعکس ہے۔ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اس کو ذہن ودل سے قریب تر رکھنے کے لئے نئی نئی راہیں نکالی جارہی ہیں جن میں تازہ ترین وہ راہ ہے جو کنیڈا میں مقیم جناب اطہر رضوی کی ایجاد ہے۔

اطہر رضوی صاحب شاعر ہیں، نثر نگار ہیں اور اردو انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ جتنا اچھا لکھتے ہیں اتنا ہی اچھا بولتے ہیں۔ خوش فکر ہیں، خوش نظر ہیں خوش وقت اور خوش باش ہیں، خوش لباس وخوش مزاج ہیں اور زندوں کی طرح زیست کرنے کو عبادت جانتے ہیں۔ چنانچہ غالب کے اس نوع کے اشعار کے اتباع میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

یہ غالب کے اقوال ہیں اور غالب کا خود اپنے اقوال پر، عامل نظر آنا ضروری نہیں لیکن غالب کے سچے عاشق جناب اطہر رضوی ان اقوال کے پابند و عامل نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کے سارے مناظر سے آنکھ لڑانے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور صرف اپنے ہم عمر و ہم مذاق خواتین وحضرات کی مجلس میں نہیں بلکہ اپنے سے چھوٹوں اور نوجوانوں کی محفلوں میں بھی لطف اندوزی اور گل افشانی کی سبیل نکال لیتے ہیں۔ زندگی کو عزم و حوصلے کے ساتھ ہنستے مسکراتے اور روشناس خلق ہو کر بسر کرنے کو حاصلِ حیات جانتے ہیں۔ خلوت نشینی و خود پوشی پر بزم آرائی و نبرد آزمائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ناکامیوں سے افسردہ خاطر ہونے کے بجائے، انھیں حصولِ کامرانی کا وسیلہ بنا لیتے ہیں اور ہر لحہ نئے طور نئی برق تجلی کے شوق سے خود کو سرشار رکھتے ہیں۔ جینے کے اس قرینے کا فیضان ہے کہ عمر رسیدگی کے باوصف ان کے جسم و جان پر کہولت و اضمحلال کے آثار نظر نہیں آتے۔ ان کی یہ حوصلہ مندی، تازہ دمی مجھ جیسوں کے لئے قابلِ رشک ہے۔

شعر و ادب کے حوالے سے میں نے عرض کیا ہے کہ وہ ایک باشعور، بامطالعہ آدمی ہیں۔ فطرت نے انھیں شعر گفتن و شعر فہمی کی صلاحیتوں سے بھی پوری طرح نوازا ہے، لیکن ان کی ادبی صلاحیت یا شوق سخن وری کی جو لہر اُن کے جسم و جان کو محیط کئے ہوئے ہے، وہ اپنی زبان، اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی ملّی و ملکی اقدار سے ان کا بے پناہ لگاؤ ہے۔ یہ اس لگاؤ ہی کا ایک رُخ ہے کہ وہ ایک مدت سے کنیڈا میں اردو شاعری کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں، پھر چونکہ اس شمع کو انھوں نے اردو کلاسیکی کے عظیم مفکر شاعر، غالب سے وابستہ کر رکھا ہے اس لئے اس کی لو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور کنیڈا کا ایوان اردو، روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا ہے۔

اس ایوان کو مستقلاً روشن رکھنے کے لئے ان کی اختراع پسند طبیعت نے شعر و ادب کے بہت سے پہلو نکال رکھے ہیں، ان میں دو پہلو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک پہلو وہ ہے جو سالانہ مذاکرے یا سیمینار کی صورت میں کسی خاص شخصیت یا موضوع کے حوالے سے برپا کیا جاتا ہے جس میں پاک و ہند کے ممتاز شاعر و ادیب شرکت کر کے اس کی گونج کو صرف مقامی نہیں رہنے دیتے بلکہ دور دور تک پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ غالب و کلامِ غالب کی تفہیم و تبلیغ

کو اپنی زندگی کا مشن بنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ وقفے وقفے سے طرحی مشاعرے منعقد کرتے ہیں اور غالب کے مصرعوں کو طرحی مصرع قرار دے کر، شعراء کو ان پر غزل کہنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان طرحی غزلوں کو یکجا کتابی صورت میں شائع کر کے اردو اور غالب دونوں کے پرچم دیارِ غیر میں بلند رکھتے ہیں۔

بعض حضرات آج کل طرحی مشاعروں کو بے وقت کی راگنی خیال کرتے ہیں ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اردو شاعری اور غالب کے حوالے سے اطہر رضوی کے بنا کردہ، طرحی مشاعرے کی روایت کے کئی بہت اہم پہلو ہیں۔ طرحی غزلوں کی یہ روایت صرف، نو آموز شعراء کو نہیں بلکہ پختہ مزاج شعراء کو بھی بہت کچھ دیتی ہے۔ غزل کہنے کے لئے جو مصرع دیا جاتا ہے شاعر کو اس کی معنوی تہہ داریوں پر بار بار غور کرنا پڑتا ہے، اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کو اپنے قلب و ذہن میں اُتارنا پڑتا ہے، ساتھ ہی اصول قافیہ، وزن کے ارکان اور بحر و زمین، سب کو توجہ کا مرکز بنانا پڑتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ ہر شاعر اپنے آپ کو شعر گوئی، فن شعر گوئی اور زبان و بیان کے رموز و نکات سے مزین کر لیتا ہے۔ طرحی مشاعروں کی یہی وہ افادیت ہے جس سے استفادے کی راہیں جناب اطہر رضوی نے ایک مدت سے کھول رکھی ہیں۔

یہ تو ان مشاعروں کی عمومی افادیت کی بات تھی، ان کا خصوصی رُخ یہ ہے کہ یہ طرحی مشاعرے غالب اور کلامِ غالب کو متعارف کرانے، انھیں دوسروں تک پہنچانے، ان کے افقی و عمودی محاسنِ شعری کو اُجاگر کرنے اور قاری و شاعر کو غالب سے قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ طرح پر غزل کہنے والا جب غالب کی غزل کو سامنے رکھ کر غزل کہے گا تو وہ یقیناً غالب کے صرف مصرعے پر نہیں بلکہ پوری متعلقہ غزل پر ایک نظر ڈالے گا، غالب کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان پر غور کرے گا اور اپنی قوتِ متخیلہ کو غالب کا ہم سفر بنانے کی حتی الوسع کوشش کرے گا اور ایسا کرنے میں صرف یہی نہیں کہ اس کے ذہن میں جلا پیدا ہوگی بلکہ وہ شعر گوئی کی ارتقائی منزلوں کو بڑی آسانی سے طے کر سکے گا۔ اب اس خاص زاویے سے دیکھئے تو غالب کے مصرعۂ طرح کے حوالے سے اطہر رضوی کے بنا کردہ مشاعرے نہ صرف غالب و کلامِ غالب کی اشاعت و تفہیم میں معاون نظر آئیں گے بلکہ ہمارے شعراء ان کے وسیلے سے اتنا کچھ حاصل کر لیں گے کہ درجنوں کتابوں سے بھی وہ میسّر نہیں آئے گا۔

اطہر رضوی صاحب نے غالب کے سلسلے میں طرحی مشاعروں کی معرفت جس انداز سے کام کرنے کا آغاز کیا ہے، اسے بعض حضرات نے سنہ ۱۹۶۹ء میں غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر اپنانے کی کوشش کی تھی۔ غالب کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی گئی تھیں۔ تضمینوں کی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی تھیں اور غالب کے مصرعے کو طرح قرار دے کر شعری نشستیں بھی منعقد کی گئی تھیں، لیکن یہ سارا کام انفرادی نوعیت کا تھا ظاہر ہے اس کا حلقۂ اثر محدود تھا۔ اس کے برعکس اطہر رضوی صاحب نے ''بیادِ غالب'' کے زیرِ عنوان جس نوع کی طرحی غزلیں یکجا کی ہیں اور طرحی مشاعرے برپا کئے ہیں وہ اجتماعی نوعیت کا کام ہے اور صلائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجتاً اس کا حلقۂ اثر بھی بہت بڑا ہے۔ چنانچہ غالب کے نام اور کام کو دور دور تک پہنچانے، عام و خاص کو اس کی جانب توجہ دلانے اور غالب کی مقبولیت کے گراف کو بلند تر کرنے میں اس اجتماعی کام کی نوعیت و افادیت شخصی یا دوسری انفرادی کوششوں کے مقابلے میں زیادہ کارکشا و کارگر ہے۔

''بیادِ غالب'' مرتبہ اطہر رضوی میں بیس سے زیادہ شاعروں کی غزلیں شامل ہیں اور ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی کنیڈا میں آباد ہیں۔ اس میں جو طرحی غزلیں شامل ہیں ان میں چار زمینیں ردیف ''الف'' کی ہیں، چار زمینیں ''نون'' کی ہیں اور سات ردیفیں حرف ''ی'' سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''الف'' ردیف کی زمینوں کے مصرعۂ طرح اس طور پر ہیں:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

اِک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مصرعۂ اوّل پر صرف نو شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے، ان میں جوش مندوزئی کی غزل سب سے طویل یعنی سولہ سترہ اشعار کی ہے۔ بقیہ غزلیں پانچ اور نو اشعار کے درمیان ہیں۔ اپنے زورِ

بیان اور پروازِ تخیل کو سبھی نے آزمایا ہے لیکن عروج اختر زیدی کی غزل حاصلِ مشاعرہ کہی جا سکتی ہے۔ نو شعروں کی یہ غزل پوری کی پوری مرصع اور دامنِ دل می کشد کے مصداق ہے۔ اطہر رضوی اور اشفاق حسین کے یہ شعر بھی قابل توجہ ہیں:

ہم جو ہیں فردا سے قوت آزما
زحمتِ اِمروز سے گھبرائیں کیا — اطہر رضوی

ہر گلی کوچے میں سورج قید ہے
آنکھ والے اس نگر میں جائیں کیا — اشفاق حسین

''الف'' کی دوسری زمین کی غزلیں پہلی زمین کے مقابلے میں کمزور ہیں البتہ محترمہ عقیلہ شاہین کا یہ شعر بہت اچھا اور سچا ہے کہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

مسئلے ان کے کچھ نہیں ہوتے
جن کو غیرت کا مسئلہ نہ ہوا

ردیف ''الف'' کے تیسرے سلسلے کی غزلیں پہلی دو کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہیں۔ بطورِ نمونہ پہلے اطہر رضوی کے رومانی انداز کے دو شعر دیکھیے:

کنول اب آرزو کے کیا کھلیں گے
سحر ہونے میں باقی ہی رہا کیا

مسلسل میری جانب دیکھتی ہیں
انھیں اس عمر میں یہ ہو گیا کیا

دوسروں کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں جو صورت و معنی دونوں اعتبار سے قابلِ داد ہیں:

مرے آذر سمجھتا کیوں نہیں ہے
کہیں پتھر کا ہوتا ہے خدا کیا — سلیم آذر

مزاجِ شہر سے سب کو گلہ ہے
کوئی ہو آشنا ناآشنا کیا — اختر آصف

جو اپنا فرض تھا ہم نے نبھایا
بہ کارِ خیر اُمیدِ صلہ کیا
پرندے ہیں انہیں اُڑنا تھا آخر
پرندوں کو درختوں کا گلہ کیا — تسلیم الٰہی زلفی

دریچے گھر کے کر کے بند عابدؔ
ہوا کا روک لو گے راستہ کیا — عابدؔ جعفری

میں خود اپنا مخالف ہو گیا ہوں
بگاڑے گا کوئی منہ کا مزہ کیا — عابدؔ جعفری

اگر مقصد نہ ہو جینے کا مسلمؔ
تو ایسی زندگی کا فائدہ کیا — مسلمؔ چشتی

ردیف ''الف'' کی چوتھی زمین جس کا مصرعۂ طرح تھا ''ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا'' اس پر صرف نو شاعروں نے توجہ دی ہے اور ہر ایک نے ایک دو شعر اچھے نکال لئے ہیں لیکن ڈاکٹر خالد سہیل کی پوری غزل اوروں سے بہتر ہے صرف ابتدائی دو شعر سن لیجئے:

روزِ روشن میں بھی لوگوں کا ہراساں ہونا
شام ڈھل جائے تو ماؤں کا پریشاں ہونا
خوف چپکے سے گلی کوچوں میں گھس آیا ہے
ہم نے دیکھا ہے بھرے شہروں کا ویراں ہونا

ردیف ''نون'' کی چار زمینوں کے طرحی مصرعے یہ تھے:

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

پہلا مصرعہ غالب کی نہایت شگفتہ غزل کا ہے اور اس میں انھوں نے ''کم'' اور ''ہم'' کے قافیے میں دو ایسے غضب کے شعر نکال لئے ہیں کہ ان قافیوں کو ہاتھ لگانا آسان نہیں تھا پھر بھی داغ دہلوی نے دونوں قافیے اپنائے ہیں اور خالص غزل کے بہت خوبصورت اشعار نکالے ہیں۔ پہلے غالب کے شعر دیکھئے:

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اب داغ کے اشعار کا لطف اُٹھایئے اور قافیوں کے خوبصورت مصرف کی داد دیجئے:

غنیمت ہے چشمِ تغافل بھی اُن کی
بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

اُدھر شرم حائل، اِدھر خوف مانع
نہ وہ دیکھتے ہیں، نہ ہم دیکھتے ہیں

''بیادِ غالب'' مرتبہ اطہر رضوی میں بھی ان قافیوں کو برتا گیا ہے لیکن کسی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی، پھر بھی ''کم'' کے قافیے کے بعض اشعار دیکھتے چلئے کہ بہر حال داد کے قابل ہیں۔

ستاروں کی جا کر خبر لانے والے
زمیں کے مسائل کو کم دیکھتے ہیں — اسماء وارثی

عجب اِن دنوں رنگ ہم دیکھتے ہیں
زمیں اپنے محور پہ کم دیکھتے ہیں — اشفاق حسین

رہِ عشق کے پیچ و خم دیکھتے ہیں
ہر اندیشۂ بیش و کم دیکھتے ہیں — عروج اختر زیدی

حسیں کون ہے وہ صنم دیکھتے ہیں
تراشا ہے کس نے یہ کم دیکھتے ہیں — سلیم آذر

غالب کے دوسرے قافیوں کا کوئی قابلِ ذکر مصرف ''بیادِ غالب'' میں نظر نہیں آیا البتہ یہ کیا کم ہے کہ غالب کی زمین کو ہاتھ لگایا گیا اور غزل کہی گئی۔

''نون'' کی زمین کا دوسرا مصرعۂ طرح یہ تھا ''ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں'' اس غزل میں غالب نے ''جواب'' کا قافیہ یوں نظم کیا ہے:

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالب کی اس زمین میں متعدد اساتذہ کی غزلیں ہیں اور انھوں نے بھی ''جواب'' کے قافیے پر طبع آزمائی کی ہے بطورِ مثال دو تین شعر دیکھیے:

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں — ذوق

کہتے ہو ہم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اِک جواب میں — مومن

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
اپنی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں داغؔ

بے قصد لکھ دیا ہے گلہ اضطراب میں
دیکھوں کہ کیا وہ لکھتے ہیں خط کے جواب میں امیرؔ مینائی

حیرت کی بات یہ ہے کہ ''بیادِ غالب'' کے کسی شاعر نے اس قافیے کو ہاتھ نہیں لگایا اگرچہ سامنے کا قافیہ تھا، دوسرے قافیوں میں البتہ بعض اچھے اشعار نکال لئے ہیں صرف اشفاق حسین اور عروج اختر زیدی کے دو دو شعر دیکھئے:

میں حرف حرف ہوں تری دل کی کتاب میں
مجھ کو بھی پڑھ کہ میں بھی ہوں شامل نصاب میں
پھر دیکھ کیسے سجتی ہے تاروں کی انجمن
تو خواب ہی کی طرح سہی آ تو خواب میں اشفاق حسین

روحیں لہو لہو تو بدن ہیں عتاب میں
ہے مبتلا یہ ملک مرا کس عذاب میں
عہدِ خزاں نے دیکھے نہ ہوں گے جو خواب میں
ہم نے وہ دُکھ اُٹھائے ہیں فصلِ گلاب میں عروج اختر زیدی

ردیف ''نون'' کا تیسرا مصرعۂ طرح تھا ''میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں'' غالبؔ کا پورا شعر اس طور پر ہے اور ضرب المثل بن چکا ہے:

مہرباں ہو کے بلا لو، مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

تخیل والفاظ دونوں لحاظ سے یہ شعر اتنا بلند ہے کہ اس کے مصرعۂ طرح کو چھونا اور اس پر کامیاب گرہ لگانا محال تھا لیکن نزہت صدیقی نے محال کو آسان کر دکھایا۔ ان کی تضمین کا شعر دیکھئے:

پھر پلٹ کر نہیں آیا وہ جو کہتا تھا کبھی
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

نزہت صدیقی نے پانچ شعر کی مختصر سی غزل کہی ہے۔ پوری کی پوری غزل بلند پایہ ہے اور ان کی فطری صلاحیت شاعرانہ پر دلالت کرتی ہے اس لئے بقیہ اشعار بھی دیکھتے چلئے:

عشق وہ شمع نہیں ہے کہ جلا بھی نہ سکوں
دل وہ اقلیم نہیں ہے کہ لٹا بھی نہ سکوں
تاب، دل میں اسے کھونے کی کہاں سے آئے
اور پانا اسے چاہوں تو میں پا بھی نہ سکوں
خاک ہو جاؤں تو ممکن ہے، ہوا، لے جائے
میں کہ سنگِ درِ جاناں ہوں کہیں جا بھی نہ سکوں
زخم، دل کا ہے سو آنکھوں میں اُتر آئے گا
راز ایسا ہے کہ چاہوں تو چھپا بھی نہ سکوں

عابد جعفری اور اعجاز بزمی کے مندرجہ ذیل اشعار بھی خوبصورت شاعری کی خوبصورت مثال ہیں۔

امتحاں لیتے ہیں غالبؔ کی زمیں میں اطہرؔ
شعر کہہ بھی نہ سکوں بات بنا بھی نہ سکوں — عابدؔ جعفری

سینہ چاکانِ وطن پر جو قیامت گزری
چاہوں روداد سنانی تو سنا بھی نہ سکوں — اعجاز بزمیؔ

ردیف ''نون'' کا چوتھا مصرعہ تھا ''ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں۔'' سچ بات یہ ہے کہ خود غالبؔ بھی اس زمین میں کوئی ایسا شعر نہیں نکال سکے جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جسے ان کی غیر معمولی شاعرانہ فطانت کی دلیل بنا کر پیش کیا جا سکے۔ ایسے میں ''بیادِ غالب'' کے شاعروں کے لئے اس زمین میں اشعار نکالنا آسان نہ تھا پھر بھی بعض نے بہت کامیاب طبع آزمائی کی ہے دو تین شعر دیکھئے:

حشر میں مجھ سے جو پوچھیں گے ترے ظلم کی بات
یاد آئی بھی تو کہہ دوں گا مجھے یاد نہیں
زندگی لطف کشاکش کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ چمن کیا کہ جہاں گھات میں صیاد نہیں — خلیل یوسف

دردِ دل، ایک عطا ہے کوئی بیداد نہیں
کیسے انسان ہو، احسان پہ بھی شاد نہیں
یہ وہ لنکا ہے جہاں سارے ہیں باون گز کے
کون شاعر ہے سوا میرے، جو استاد نہیں — جوش مندوزئی

رونقِ بزمِ جنوں خواب، کہ مانندِ بہشت
حیف اب کوچۂ جاناں بھی تو آباد نہیں
دشت وصحرا کی، نہ اب، کوچۂ جاناں کی خبر
دلِ گم گشتہ کو کچھ، اپنا پتا یاد نہیں — نزہت صدیقی

ردیف ''ی'' کے ساتھ طرحی مصرعوں پر ''بیادِ غالب'' کے شعراء نے غزلیں کہی ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ غزلیں پہلی دو ردیفوں یعنی ''الف'' اور ''نون'' کی غزلوں کے مقابلے میں بہ حیثیت مجموعی کمزور ہیں اور ایسا ہونا حیرت انگیز نہیں، وجہ یہ ہے کہ غالبؔ کی جن غزلوں سے مصرعۂ طرح دیئے گئے ہیں وہ غزلیں خود بھی غالب کی دوسری غزلوں کی بہ نسبت کمزور ہیں۔ سات متعلقہ غزلوں میں سے صرف ایک غزل ایسی ہے جسے غالب کی بہترین غزلوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، میری مراد اس غزل سے ہے جو ''حال اچھا ہے، کمال اچھا ہے، سال اچھا ہے'' کی زمین میں ہے۔ ورنہ بقیہ چھ غزلیں بہت معمولی درجے کی ہیں۔ ان غزلوں کے اشعار میں اتنی سکت نہیں کہ وہ زبان زدِ خلائق ہو جاتے یا ضرب المثال بن جاتے بلکہ سچ یہ ہے کہ خاص خاص صاحبان ادب کے سوا غالب کی ان غزلوں کے اشعار شاید ہی کسی عام قاری کے ذہن میں محفوظ ہوں۔ ایسے میں اگر ''بیادِ غالب'' کے شعراء، بلند پایہ طرحی غزلیں کہنے میں کامیاب نہ ہو سکے، تو

اس سے ان کی سخن گوئی پر حرف نہیں آتا۔ یہ زمینیں اپنی ساخت و مزاج میں اتنی مشکل، ناشگفتہ اور ناہموار تھیں کہ ان میں اچھے اشعار نکالنا آسان نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ خود غالب بھی ان زمینوں میں اس پائے کے اشعار نہیں کہہ سکے جن کی بدولت انھیں شہرتِ عام و بقائے دوام کے دربار میں جگہ ملی ہے۔ بایں ہمہ میں ''بیادِ غالب'' کے شاعروں کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے ایسی سخت زمینوں میں طبع آزمائی کی اور بعض بہت اچھے اشعار نکال لئے۔ چند شعر دیکھئے:

ہم کہ دانشور بڑے، شاعر عظیم
سب کرشمے ہیں خیال خام کے — ضیاء علیگ

نارسائی کاتب تقدیر تھی
فاصلے تھے ایک یا دو گام کے
عہدِ تجدید مراسم کس لئے
یہ مرے ناراض شانے تھام کے — صبیحہ صبا

چہرے پہ جو لکھا ہے اسے پڑھ تو لیں مگر
اک اور داستان پسِ داستان ہے — اشفاق حسین

--- --

دور تھے ہم سے تو اندیشے تھے اور
قربتوں میں بدگمانی اور ہے
دشمنوں کی دشمنی کچھ کم نہ تھی
دوستوں کی مہربانی اور ہے — جوش مندوزئی

اور بھی ہیں لوگ پر اس شخص میں
ایک طرز دلستانی اور ہے — عقیلہ شاہین

چودھویں کا چاند بے شک خوب ہے
اُن کا رنگ، اُن کی جوانی اور ہے — اطہر رضوی

ایک تو ان گنت مسائل ہیں
اور پھر سوچنے کی عادت ہے — تسلیم الٰہی زلفی

ہجرت کی منزلوں میں ہر اک خاندان کی
اِک نسل مطمئن ہے، مگر اک اداس ہے — اشفاق حسین

اس کی صورت سے مشابہ ہے تو مہتاب ہے خوب
اس کے ابرو کی طرح ہے تو ہلال اچھا ہے — عقیلہ شاہین

دل کو امید ہے اب تک ترے لوٹ آنے کی
پیاس کے دشت میں بارش کا خیال اچھا ہے — اشفاق حسین

عافیت میری جو پوچھیں تو انھیں کہہ دینا
ہر نئے دیس میں بنجاروں کا حال اچھا ہے — اطہر رضوی

لکۂ ابرِ گریزاں جو نہ برسے نہ سہی
دل کے آنگن میں ترے غم کا نہال اچھا ہے — سلیم صدیقی

مختصر یہ کہ اطہر رضوی صاحب کی ایجاد خیال کا مرقع ''بیادِ غالب'' جس میں برصغیر سے بہت دور یعنی کینیڈا میں مقیم بیس سے زائد شعراء کی طرحی غزلیں شامل ہیں۔ اردو شعر وسخن کی تاریخ میں ایک تازہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک طرف راہِ سفر میں قدم آگے بڑھانے والوں کی رہنمائی کرے گا، دوسری طرف اطہر رضوی کے ہاتھوں غالب اور کلامِ غالب کی مقبولیت کے پرچم کو بلند سے بلند تر کرنے کا وسیلہ بنے گا۔

دامِ آگہی: مغرب میں غالبؔ شناسی کی تازہ مثال

''دامِ آگہی'' انگریزی زبان میں ہے اور کولمبیا یونیورسٹی (نیویارک) کی پروفیسر ڈاکٹر فرانسس ڈبلیو پریچٹ (Frances W.Pritchett) کی تصنیف ہے۔ فرانسس پریچٹ، کولمبیا یونیورسٹی کے شعبے ''ماڈرن انڈک لینگویجز'' میں ایک عرصے سے پڑھا رہی ہیں اور شعبہ اردو کی چیر پرسن ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع اور ذہن رسا ہے۔ اردو غزل، اور غزل کے آہنگ سے ان کے ذوق ادبی کو خاص مناسبت ہے چنانچہ اردو غزل کے سرمایے کو بیسویں صدی کے بعض اردو ناقدوں کی طرح فرانسس نے کم عیار و بے وقعت نہیں جانا بلکہ ان کے نزدیک غزل کی شاعری، اردو کی سب سے قیمتی اور ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری ہے اور اسے کم مایہ خیال کرنے والے غلطی پر ہیں۔

پروفیسر فرانسس پریچٹ کو موسیقی، عروض اور داستان وفنِ داستان سے بھی گہری دلچسپی ہے اور ان سب پر بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے۔ اردو کی طرح انھیں جدید ہندی اور ناگری رسم الخط سے بھی پوری واقفیت ہے لیکن انہی کے بقول، غزل کے حوالے سے اردو زبان سے انھیں عشق ہے اور ان کا زیادہ وقت اردو کے مطالعے میں صرف ہوتا ہے۔

پروفیسر فرانسس پریچٹ سے میری پہلی ملاقات کوئی چودہ پندرہ سال پہلے دہلی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے گھر پر ہوئی تھی، پھر اس کے بعد وہ جب بھی پاکستان آئیں مجھے ملاقات کا موقع دیا اور میں بھی جب کبھی امریکہ گیا تو ان سے ضرور ملا اور یوں ان کے میرے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔ نتیجتاً اب سے دو سال پہلے جب میرے کچھ دوستوں اور شاگردوں نے امریکہ اور کینیڈا میں ''جشنِ فرمان'' کا ڈول ڈالا تو پروفیسر پریچٹ صاحبہ اس میں خوش دلی کے ساتھ

شریک ہوئیں اور مجھے اپنے کلماتِ تحسین سے بھی سرفراز کیا۔

اس دفعہ امریکہ میں جب ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام کو جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد صاحب کے گھر ایک استقبالیہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی لطف ارزانی وایجاد طبع نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ انھوں نے مجھے ایک بہت خوبصورت ٹی شرٹ بطور تحفہ عطا فرمائی اور اس تحفے کی معرفت فرمان نوازی سے بڑھ کر انھوں نے اپنی اردو دوستی اور غالب شناسی کا ثبوت فراہم کیا۔ وہ اس طرح کہ ٹی شرٹ کے دامن پر نہایت خوشخط اور جلی حرفوں میں غالب کا یہ شعر مرقوم ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ لادوا پایا

اس شعر کو انھوں نے پہلے تحت اللفظ میں ایسے موثر و دلآویز پیرائے میں حاضرین کو پڑھ کر سنایا کہ معنی کی وضاحت کے ساتھ ساتھ شعر کی تاثیر بھی حاضرین کے دلوں میں اُتر گئی۔ بعد کو انھوں نے دوسرے مصرعے کی طرف خصوصاً توجہ دلائی اور کہا کہ ''جب میں اس شعر کو تختہ سیاہ پر لکھ کر طلبہ و طالبات کو پڑھاتی ہوں تو اس کے بعض الفاظ کی طرف خصوصاً توجہ دلاتی ہوں اور یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتی ہوں کہ اردو رسم الخط مشکل نہیں بہت آسان ہے۔ دیکھئے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں بیشتر الفاظ کے حروف الگ الگ بغیر کسی جوڑ کے لکھے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالائی شرٹ کے ساتھ پروفیسر فرانسس نے ''دامِ آگہی'' نام کی اپنی وہ قیمتی کتاب بھی اپنے آٹوگراف کے ساتھ مجھے عطا کی جس کا ذکر میں نے ابتدائی سطور میں کیا ہے۔ محترمہ فرانسس سے تحائف وصول کرتے ہوئے میں نے اپنی کچھ نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے متعلق اپنی وہ تازہ کتاب بھی ان کی خدمت میں پیش کی جس کا انتساب میں نے ان کے نام نامی کے ساتھ کیا تھا۔ نشست کے آخر میں حاضرین میں سے بعض نے اردو زبان وادب اور ان کی تدریس وتنقید کے بارے میں کچھ سوالات کیے جن میں سے کچھ کے جوابات میں نے اور بیشتر کے جوابات پروفیسر فرانسس نے اردو زبان میں دیئے۔ آخر میں کسی نے فرانسس سے پوچھا ''اردو میں آپ کا پسندیدہ شاعر کون ہے؟'' جواب دیا گیا ''غالب'' اس جواب کے فوراً بعد فرمائش کردی گئی کہ اچھا تو غالب کے دو ایک پسندیدہ شعر سنایئے۔ فرانسس نے نہایت شستہ لہجے میں بے ساختہ یہ پانچ اشعار سنائے:

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سرو پا ہیں
کہ ہے سر پنجہ مژگان آہو پشت خار اپنا
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

فرانسس کی زبان سے اعتماد بھرے لہجے میں یہ اشعار سن کر حاضرین حیرت زدہ رہ گئے اور مزید سوالات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ''دامِ آگہی'' انگریزی زبان میں ہے اور اس کا یہ نام غالب کے اس شعر سے ماخوذ ہے:

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

کتاب کا اصل نام انگریزی میں "Nest of Awareness" ہے اور اس میں اردو شاعری اور اس کی تنقید کا قابلِ تحسین جائزہ لیا گیا ہے۔ پوری کتاب دوسو چونتیس صفحات میں ہے اور یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب کتنی اہم ہے، اردو شاعری کے کن کن موضوعات و مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور کس عہد تک کی شاعری کو زیر بحث لاتی ہے؟ ان

سوالوں کے جوابات کے لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے ایک آدھ صفحے اصل صورت ہی میں منتقل کردیے جائیں تاکہ بات بے کم وکاست قارئین تک پہنچ سکے۔

Nests of Awareness is a study of an episode in the cultural and literary history of late nineteenth century North India: a look at how the classical ghazal, which for centuries had been the pride and joy of Indo-Muslim culture, was abruptly dethroned and devalued within its own milieu, and by its own theorists. The break with tradition was so sharp that now a days some aspects of the ghazal are obscure, and others even markedly distasteful, to most modern readers. I argue that the cause of this abrupt "paradigm shift" was not ultimately literary so much as political. The violent "Mutiny" of 1857, and the vengeful British reaction to it, destroyed the said world of the Indo-Muslim clite. After 1857, the victorious British had the only game in town: they were obviously, "naturally" superior, and they made, the everyone realized it. Azad himself, in another context, described the fault. "The important thing is that the glory of the winners' ascendant fortune gives everything of theirs -- even their dress, their gaps, their conversation -- a radiance that makes them desirable. And people do not merely adopt them, but are proud to adopt them. Then they bring forth, by means of intellectual arguments, many benefits of this."

Such adoption of a new culture may be a fine thing, certainly both Azad and Hali were officially and strongly committed to the benefits of Westernization. But however good a face they managed to put on it, the result was clear: after 1857 they found themselves having to perform radical surgery on their own culture, to enable it to survive in a world defined by the victors. Azad and Hali set out to replace their

inherited Indo-Persian concept of poetry with what they understood to be the contemporary English once: a Wordsworth-like vision of "natural" poetry.

If Wordswothian poetry was the touchstone of naturalness, however, the whole Indo-Muslim poetic tradition was bound to appear "unnatural" in comparison -- not just literarily decadent, artificial, and false, but morally suspect as well. And if, as many English writers argued, poetry was inevitably a mirror of society, then the cultural for must go much deeper. The result was sweeping, internally generated indictment with which Urdu speakers have been struggling ever since. A History of Urdu Literature was reprinted in 1984, shortly before its author's death, in an expanded second edition. Professor Sadiq added much new material; but he did not change a word of his harsh attack on the ghazal.

The present study has three parts in the first part I locate the lives of my two central characters, Azad and Hali, within their cultural and literary setting; in the second part I seek to reconstruct the orally transmitted poetic concepts that Azad and Hali inherited -- concepts that are now little known and even less understood; in the third part I analyze the new anticlassical poetics that Azad and Hali defined with such urgency and power.

I hope, of course, that this book will be useful to lovers of Urdu literature both here and in South Asia, and to scholars of North Indian culture and history. But I have also tried my best to make the subject as vivid and interesting to others as it is to me. I will be delighted if people who know little or nothing about Urdu literature can find in this book a starting point. For this reason, I have included not only a glossary of key literary terms, but also an appendix containing an example

of ghazal, literally translated and with its parts explained. Also for this reason, I have used English sources whenever possible, so that the reader can consult them independently; usually, however, there aren't any, and in such cases all translations are my own.

This story takes place in North India only a little over a century age, he blind of an eye in historical time. Worlds were in collision. The powerful momentum of the advancing British Raj encountered the political inertia of the declining Mughal Empire. The irresistible force met the heretofore immovable object -- and rolled over it. Azad and Hali, survivors of this great historical collision, were absolutely determined that their literature -- and with it their culture -- would not die from the shock. Their urgent attempts at triage, surgery, and sometimes euthanasia were not always successful. But their larger purpose was achieved. The Indo-Muslim community survived its darkest hours, learned to play the new game by the new rules, and was able once again to face the future with purpose and hope. New, a century later, it can consider reclaiming some of the best achievements of the old game.

Our own generation can take pride in a widening rage of cultural encounters that has opened over time to more and more people. We expect cultures to clash, and we try to appreciate the dissonances. But we also know that (as Azad put it) "if you examine the temperaments of individual men who live thousands of mile apart and in countries with different characters, you will see, since human nature is one, to what extent their thoughts resemble each other's". Across the continents and the decades I solute Azad and Hali: with their backs to the wall, they had the courage to fight for survival

and renewal. They tried desperately to recognize their culture into lines of defense that could resist the Victorian onslaught. Even when they attached their own poetry most bitterly, their love for it was never in doubt. And even when I disagree with them most strongly, I know that they would understand my own larger purpose. For we can now see that the poetry itself has stood firm over time. The Victorians are dead, and the ghazal lives.

Or at least, the British Victorians are dead; but many South Asian Victorians remain. They view the ghazal through the special distorting lenses provided by Azad and Hali -- yet in many cases, such is the power of the poetry, they guiltily find themselves loving it anyway. This book is dedicated to the memory of Azad and Hali, and to everyone who loves classical Urdu Poetry. For nowadays cultures belong to those who choose them. And I am proud to consider myself an heir to the rich and inexhaustible tradition of the ghazal.

گویا کتاب حقیقت میں انیسویں صدی کے اواخر تک کی اردو شاعری کا پورا احاطہ کرتی ہے اور چونکہ اس ساری شاعری کا قابلِ قدر اور ہمیشہ زندہ رہنے والا اثاثہ غزل کی صورت میں ہے، اس لئے پروفیسر فرانسس پریچٹ نے عملاً غزل ہی کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ غزل، غزل کے شعر، شعر میں الفاظ کے استعمال کی اہمیت، ثقافتی اثرات، روایتی تلازمات اور ربط و روانی پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے اور غزل کی اہمیت کو بالکل نئے انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ اردو شاعری کے کلاسیکی نقادوں میں انھوں نے تذکرہ نگاروں کو بھی نظر میں رکھا ہے اور جگہ جگہ ان سے مدد لی ہے لیکن ان کی اصل توجہ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی پر مرکوز رہی ہے۔ فرانسس نے ان دونوں کو اردو شاعری کا محافظ و مسیحا قرار دیا ہے اور ان کی کوششوں کو اردو شاعری کی اصلاح کے ساتھ ساتھ غزل کے احیا اور حیاتِ نو کے لیے بھی فالِ نیک جانا ہے۔ یہ نتائج انھوں نے وسیع مطالعے اور گہرے غور و فکر کے بعد اخذ کیے ہیں اور تنقیدِ شعر کے باب میں اپنی بالغ نظری و بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

غالب سے متعلق اپنی کتابوں کے دیباچے

دیباچہ ''غالبؔ شاعرِ امروز وفردا''

اُردو میں غالبؔ کا نام بالعموم میرؔ، نظیرؔ اور اقبالؔ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ تینوں اردو کے منفرد اور ممتاز شاعر ہیں لیکن غالب کی حیثیت ان سے بہت مختلف ہے۔ غالب صرف عظیم شاعر ہی نہیں، عظیم نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری اور نثر دونوں کو یکساں متاثر کیا ہے۔ دونوں کو ایک نہایت دل کش، فکر انگیز، اچھوتا، تہہ دار اور پرکار و باوقار لب ولہجہ دیا ہے۔ ایسا لب ولہجہ جس کی کوئی دوسری مثال اُردو میں نظر نہیں آتی۔ اس لیے اُن کا نام دنیا کے صرف ان گنے چنے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ لینا مناسب ہوگا جو بہ یک وقت، نثر و نظم دونوں میں منفرد خلاّق حیثیتوں کے مالک ہیں۔

اُردو نثر میں غالب کی یادگار صرف اُن کے مکتوبات ہیں، لیکن یہ مکتوب محض مکتوب نہیں رہے، ادب کا لازوال سرمایہ بن گئے ہیں۔ یہ سرمایہ تخلیقی حیثیت سے اُردو میں ''گلستانِ سعدی'' کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اس کی سادگی، دلکشی اور اثر پذیری واثر آفرینی کے نشانات سرسید سے لے کر مولانا حالی، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، سیّد وقار عظیم، آلِ احمد سرور اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تک، ہر سنجیدہ نثر نگار کے یہاں صاف نظر آتے ہیں۔

شاعر کی حیثیت سے ان کی دین شاید اس سے بھی زیادہ ہے۔ اُردو غزل کو انھوں نے ایک نئے جہانِ معنی سے آشنا کیا ہے۔ اس میں عظمت و وقعت کے تازہ آثار پیدا کیے ہیں۔ تقلید و روایت سے بغاوت کرکے زندگی کے جدید تر میلانات ور جحانات میں تغزل کا رنگ بھرا ہے۔ اُردو

شاعری کو فکر انگیز حکیمانہ اسلوب دے کر اُس کی سطح کو بلندی بخشی ہے۔ الفاظ کی شعبدہ گری پر افکار کو ترجیح دی ہے۔ شاعری کو لفظی صناعی اور قافیہ پیمائی کے طلسم سے نکال کر فکر و شعور کی حیات افروز فضا میں داخل کیا ہے۔ زمین اور زمین پر بسنے والوں کے مسائل و نفسیات کو شعر کا موضوع بنا کر زندگی اور ادب کا رشتہ استوار کیا ہے۔ بادہ و ساغر کے ذکر اور آرائشِ خم کاکل کے شغل کو مشاہدۂ حق کی گفتگو اور اندیشہ ہائے دور دراز کا حاصل قرار دیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کو اعلیٰ انسانی مقاصد سے ہم آہنگ کر کے اُسے بنی نوع انسان کے زخمِ دل کا مرہم بنایا ہے۔

شعر و ادب کی طرح شاعروں اور ادیبوں پر بھی انھوں نے بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایک دو نہیں، اُن کے بعد سارے چھوٹے بڑے شاعر و ادیب بقدرِ حوصلہ اُن کے فکر و فن سے مستفید ہوئے ہیں۔ شاعروں میں پچھلے سو سال میں، حالی سے لے کر سجاد باقر رضوی تک سب نے کسی نہ کسی طور پر اُن سے اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال ادیبوں کا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جس نے غالب اور کلامِ غالب کے زیر اثر اُن پر اظہارِ خیال اور ان کے کمالاتِ فن کا اعتراف نہ کیا ہو۔

اُن کی ہمہ گیری اور ہمہ جہت اثر پذیری سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی شخصیت معمولی نہیں غیر معمولی، اور اُن کا مقام بلند نہیں، حد درجہ بلند ہے۔ اتنا بلند کہ اگر کوئی شخص بہ زعمِ خود اس بلندی تک دیکھنے کے لیے گردن اُٹھائے اور احتیاط سے کام نہ لے تو اُس کی ٹوپی سر سے غائب نظر آئے گی یا وہ خود دھڑام سے زمین پر آ رہے گا۔ لوگ اُس کی حالت پر ہنس پڑیں گے، اس جگ ہنسائی کے باوجود گرنے والا گھاٹے میں نہ رہے گا۔ ڈاکٹر عبد اللطیف اور مرزا یگانہ چنگیزی کی طرح اُس کا نام بھی بہر حال غالب کے طفیل شہرت پا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ دنیائے ادب میں اس کا شمار سخن فہموں میں نہیں، طرف داروں میں کیا جائے گا۔

اس کے برعکس اگر آپ احترام و احتیاط کے ساتھ غالب کے فکر و فن کی بلند چوٹیوں پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں اور آپ کی نظر کسی چوٹی تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو جائے تو اس بلند نظری کی نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ جو بلندیاں اور خوبیاں بجائے خود آپ کی ذات میں چھپی ہوئی

ہیں، وہ تیزی سے اُبھر کر منظرِ عام پر آ جائیں اور دوسروں کو آپ کی بڑائی کا قائل بنا دیں۔ یہ بات محض برائے بیت نہیں، واقعہ یہ ہے کہ اُردو میں کئی ایسے محقق و نقاد ہیں جو اسی کوشش کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز و سربلند ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی نظر فلسفہ پر کتنی ہی گہری کیوں نہ رہی ہو، لیکن یقین جانیے اگر وہ ''محاسنِ غالب'' کے نام سے ایک مقالہ نہ لکھ جاتے تو اُردو ادب میں اُن کے زندہ رہنے کی گنجائش نہ نکلتی، نقاد کی حیثیت سے کوئی اُن کا نام بھی نہ جانتا۔

شیخ محمد اکرام نے اسلامی ثقافت اور ملّی تحریکات پر جو کچھ بھی لکھا ہو، ہمیں سرِ دست اس سے سروکار نہیں، لیکن اتنا سب جانتے ہیں کہ اُردو ادب میں اُنھیں جو شہرت و عزت ملی ہے وہ صرف ''غالب نامہ''، ''آثارِ غالب'' اور ''ارمغانِ غالب'' کے مصنف کی حیثیت سے ملی ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی مہیش پرشاد، مولانا غلام رسول مہر، مولانا امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام اور ڈاکٹر مختارالدین احمد کے علمی و ادبی کارنامے اور بھی ہیں لیکن اُردو تحقیق و تنقید میں اُنھیں جو اعزاز و بلند مقام حاصل ہے وہ غالب اور غالبیات پر گہری نظر رکھنے ہی کا انعام ہے۔

بعض دوسرے اہلِ قلم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر شوکت سبزواری ایک معتبر نقاد کی حیثیت سے اوّل اوّل ''فلسفۂ کلامِ غالب'' ہی کی بدولت سامنے آئے ہیں۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر آفتاب احمد نے کچھ زیادہ نہیں لکھا، پھر بھی اپنے متفرق مضامین میں انھوں نے غالب کے سلسلے میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے، اُس نے اُنھیں صاحبِ بصیرت ناقدوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔

پروفیسر سیّد معین الرحمن، ہر چند کہ پچھلے چند برسوں سے باقاعدہ لکھ رہے ہیں لیکن پچھلے دو سال میں خصوصیت سے انھوں نے غالب کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اور غالبیات سے متعلق تنقیدی اور تحقیقی تفصیلات کے ساتھ جو ''اشاریۂ غالب'' تیار کیا ہے، اُسی نے اُن کے قلم کو علمی و ادبی حلقوں میں اتنی جلد معتبر و موقر بنایا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم، اکبر علی خان، مسلم ضیائی، قدرت نقوی اور نثار احمد فاروقی کے تحریروں کو بھی تیزی سے رُتبۂ اعتبار تک پہنچانے میں غالب کا بڑا ہاتھ ہے۔

مولوی عبدالباری آسی، بے خود موہانی، قاضی سعید الدین، نظم طباطبائی، آغا محمد باقر، پروفیسر سلیم چشتی، شوکت میرٹھی اور اس طرح کے کتنے اہلِ قلم ہیں جو صرف کلامِ غالب کی شرح لکھنے کے سبب ہماری توجہ کا مرکز بنے ہیں۔

یہی کیفیت اُن مصوّروں کی ہے جنھوں نے کلامِ غالب کے تصویری مرقعے تیار کیے ہیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی اور صادقین نے ہمیں غالب کی عظمت کا احساس دلایا ہو یا نہ دلایا ہو، غالب نے ہمیں اُن کی عظمت کا احساس ضرور دلایا ہے۔ یہی نہیں، غالب کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ شاعری نے اُن کے نام کو نہیں بلکہ خود انھوں نے شاعری کے نام کو اونچا کیا ہے:

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

ان مختصرات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی شخصیت یک پہلو نہیں ہشت پہلو ہے۔ اُن کا فن یک رنگ نہیں صد رنگ ہے۔ اُن کی ادبیت یک شیوہ نہیں ہزار شیوہ ہے۔ اُن کی ذات یک صفت نہیں جامع الصفات ہے۔ اردو میں اُن کی اوّلیاتؔ ایک دو نہیں سینکڑوں ہیں اور شعر و ادب پر ان کے احسانات دو چار نہیں بے شمار ہیں۔

اب اگر اپنی ذات کے حوالے سے میں یہ کہوں کہ اس ہمہ جہت و ہمہ گیر شخصیت سے میرا تعلق صرف ذہنی ہی نہیں، جذباتی بھی ہے اور آج سے نہیں شروع ہی سے ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس لیے کہ مجھ جیسے ادب کے نہ جانے کتنے طالب علم اُن سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں گے۔ لیکن میں نے جو بات کہی ہے وہ نئی یا انوکھی نہ سہی، سچ ضرور ہے اور سچ بات نئی بات سے کم اہم نہیں ہوتی۔ میں نے اسی کتاب میں کسی جگہ لکھا ہے کہ میں غالب کے اس دعویٰ نبوت پر:

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے

غالبؔ اگر ایں فنِ سخن دین بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اس وقت سے ایمان لایا ہوں:

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

ہوا یوں کہ تعلیم وتربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سنِ بلوغ تک، گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا، اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ میرے ذہن کے لاشعور خانے کا جزو بن گئے۔ جیسے جیسے شعروسخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان اُن کی نبوتِ شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہنما و مشکل کشا بن گئے۔

یہ مشکل کشائی وراہنمائی میری حد تک کس نوع کی ہے، اس کی تفصیل بھی آپ کو اسی کتاب میں کسی جگہ مل جائے گی۔ یہاں اس بات کا اعادہ البتہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور مطالعۂ غالب کا یہ فیضان میرے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ صلائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صلائے عام کی کیا صورت ہے، اس سلسلے میں، میں کیا عرض کروں۔ میرے دل کی بات پنجاب یونیورسٹی شعبہ اردو میں غالبیات کے پروفیسر سیّد وقار عظیم صاحب نے اپنی مختصری حالیہ گفتگو میں حسب مزاج وتوقع بڑے سلیقے سے کہہ دی ہے:

''غالب کے شعر میں انسان کے نازک سے نازک، لطیف سے لطیف اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذبے اور احساس کو اظہار کی زبان عطا کرنے، اسے تصویر اور مجسمے کی صورت دینے اور تصویر و مجسمے میں روح پھونک دینے کی جو غیر معمولی قوت ہے، اس نے ہمارے لیے ہر تجربے کا ادراک ممکن بنا دیا ہے اور اس لیے غالب کا قاری جب اپنے کسی جذبے اور احساس کے معنی سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے یا اُس کی تہہ تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے ایک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے تو غالب کا کوئی نہ کوئی شعر سامنے آ کر اس سے کہتا ہے کہ دیکھو، میں تمھاری اُلجھن اور تمھاری

کشمکش کی تفسیر ہوں۔ اس صورتِ حال میں انسان کو حوصلہ دینے اور اس کا حوصلہ برقرار رکھنے کے جو امکانات ہیں، انھوں نے غالب کے شعر کو ہر دل کی آواز بنا دیا ہے۔ آدمی کو اگر یقین ہو جائے کہ دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اس کے دُکھ کے معنی سمجھتا ہے اور اسے اظہار کی زبان دے سکتا ہے تو اس کے لیے زندگی بسر کرنا اور زندگی کو بسر کرنے کی چیز سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ غالب کے کلام نے اُردو کے ہر شاعر سے زیادہ یہ خدمت انجام دی ہے۔ صرف دُکھوں ہی کی بات نہیں ہر انسانی تجربے کے معاملے میں غالب کے شعر اور اُس شعر کے پڑھنے والے کے ساتھ یہی صورت ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں وہ بن بلائے اُس کا رفیق اور دم ساز بن جاتا ہے۔"

یہ کتاب دراصل غالب کی اسی رفاقت و دم سازی کا اعتراف اور اُن کی صد سالہ برسی کے موقع پر اُن کی روح کے حضور ایک ادنیٰ سا سپاس نامہ ہے۔

غالب کا کلام جسے اُن کے "دلِ حسرت زدہ" کی تفسیر کہنا چاہیے۔ ایک "مائدہ لذتِ درد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے یار لوگ بقدرِ لب و دنداں، اپنا اپنا کام تو نکال سکتے ہیں، لیکن اپنی کسی ایک تحریر یا کتاب سے غالب کے سخن فہموں کو سیراب نہیں کر سکتے۔ کم از کم میں اپنے تئیں یہی محسوس کرتا ہوں اور اسی لیے میں اپنی اس کتاب کو غالب کے سلسلے میں ادنیٰ سپاس نامے کی حیثیت دیتا ہوں۔

میں یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غالب کے جملہ محاسنِ شعری پر محیط ہے یا اس میں غالب کی شخصیت اور فن کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ ہر طرح مکمل ہے۔ ہاں اس میں ان کی شخصیت و فن کے بعض ایسے بنیادی خال و خط ضرور مل جائیں گے، جن کی مدد سے اُن کی ذات و صفات کے متعلق بھرپور تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض خال و خط ایسے ہو سکتے ہیں جنھیں پہلے بھی محسوس کیا گیا ہوگا یا جو اس سے پہلے بھی قارئین غالب کی نظر سے گزر چکے ہوں گے لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے جو نئے پن اور تازگی کا احساس دلائیں گے۔ اس

کتاب میں غالب کی زندگی اور فن کے بارے میں بعض نئی معلومات، نئے تجربے اور نئی تاویلیں بھی ملیں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان سے غالب کو نئے زاویے یا کم از کم میرے زاویے سے دیکھنے دکھانے میں مدد ملے گی۔

یہ کتاب پندرہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ بعض تنقید کے تحت آتے ہیں اور بعض تحقیق و تنقید دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں اور مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بعض مضامین مثلاً ''غالب کے کلام میں استفہام''، ''غالب کے مقطعے''، ''مکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر''، ''غالب و اقبال'' اور ''غالب کے اُسلوبِ سخن کا ایک اہم پہلو'' پندرہ سے لے کر بیس سال پرانے ہیں اور میری تنقیدی تحریروں کے اوّلین نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی مضامین اس لحاظ سے نئے ہیں کہ پچھلے دو سال میں لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے، کتابی صورت میں غالب کے فکر و فن کی مکمل تصویر نہ سہی، تصویری ضرور سامنے لے آتے ہیں اور غالب کے قارئین اس پس منظر کی مدد سے جو غالب اور عہد غالب کے مطالعہ کی حیثیت سے اُن کے ذہن میں محفوظ ہوگا۔ اس تصویر کو بہ آسانی مکمل کر سکتے ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ ایک یہی اُمید، ان مضامین کو کتابی صورت میں یک جا کر دینے کا باعث ہوئی۔

یہ مضامین چونکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے پہلی بات تو یہ کہ ایک معنوی ربط و آہنگ کے باوجود موضوع کا تسلسل کہیں کہیں ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان مضامین میں آپ کو انتخابِ اشعار، اندازِ بیان اور خیال کی تکرار بھی نظر آئے گی۔ امید ہے کہ اس سے صرفِ نظر کیا جائے گا کچھ تو غالب کی خاطر اور کچھ اس مجبوری کے پیش نظر کہ مقالات پر مشتمل کتابوں میں اس قسم کی کمزوریاں ناگزیر ہیں۔

فرمان فتح پوری

۸ر ستمبر ۱۹۶۹ء
شعبہ اُردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی۔

دیباچہ ''تمنّا کا دوسرا قدم اور غالبؔ''

غالبؔ کے فکروفن کے بارے میں یہ میری دوسری کتاب ہے، پہلی کتاب ''غالب شاعر امروز وفردا'' غالب صدی کے جشن کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔ گویا دوسری کتاب کم وبیش پچیس سال کے وقفے کے بعد شائع ہورہی ہے۔ یہ پچیس سال دوسری علمی وادبی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ غالب اور غالبیات کو سینے سے لگائے رہنے میں گزرے ہیں۔ اس عرصے میں غالب کے بارے میں میرے کئی مضامین مختلف رسائل میں چھپے اور اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بنے۔ ان میں جس مضمون کو میں نے اپنے شعور ولاشعور کا حاصل اور ایک طرح سے القائی انکشاف وتنقید کا جزو جانا وہ ''کلامِ غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار'' تھا۔ اب یہی اس کتاب کا مضمون اوّل ہے۔

یہ مضمون اوّل اوّل ''اوراق'' لاہور میں چھپا پھر کئی اور جگہ منتخب ہوا۔ اس مضمون میں، لفظ ''تمنا'' کو غالب کے مفکرانہ ذہن کی کلید بناتے ہوئے میں نے غالب کو ایک پیشرو کی حیثیت سے اپنے مقصدِ فکروفن میں علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات سے مماثل ومشابہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ تنقیدِ غالب کے سلسلے میں میرے اس مضمون کی حیثیت کم وبیش وہی ہے جو میرے ایک پرانے مضمون ''کلامِ غالب میں استفہام'' کی تھی۔

غالب کے بارے میں میرا پہلا تنقیدی مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام'' مئی ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنؤ) میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون غالب اور غالبیات کے باب میں میرے اس طویل مطالعے اور مسلسل غوروفکر کا حاصل تھا، جسے میں ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے اپنائے

ہوئے تھا میرے حق میں یہ غالب کا احسان اور مطالعۂ غالب کا فیضان تھا کہ میرے اس مضمون کو تنقید غالب کے سلسلے میں بالکل نیا اور چونکا دینے والا مضمون خیال کیا گیا۔ سارے علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے داد دی گئی اور مجھے غالب کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔

''نگار'' میں اشاعت کے بعد ''غالب کے کلام میں استفہام'' میری کتاب ''تحقیق وتنقید ''مطبوعہ ماڈرن پبلشرز کراچی ۱۹۶۲ء میں شامل ہوا۔ ''تحقیق وتنقید'' کا ایک اڈیشن اسی سال صائقہ بک ڈپو، اردو بازار دہلی سے شائع ہوا اور اس طرح میرا یہ مضمون ہندوستان و پاکستان کے سارے ادب دوستوں اور غالب شناسوں تک پہنچ گیا۔ بعد میں مختلف رسالوں اور تالیفات کے لئے منتخب کیا گیا، متعدد اہلِ قلم نے اپنے مضامین میں اس کا حوالہ دیا اور اس کے اقتباسات سے اپنے مقالات کو مزّین کر کے میری توقیر بڑھائی۔ حتیٰ کہ غالب صدی کے موقع پر ''تنقید غالب کے سو سال'' کے زیرِ عنوان جو کتاب ''مجلس یادگارِ غالب'' لاہور سے شائع ہوئی اور جس میں ۱۸۶۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہونے والے صرف اُن مضامین کو جگہ دی گئی تھی جو تنقید غالب کے سلسلے میں اوریجنل خیال کئے گئے، اس میں بھی میرے اس مضمون کو شامل کیا گیا۔

بعد ازاں یہی مضمون میری کتاب ''غالب شاعر امروز و فردا'' مطبوعہ اظہار سنز، لاہور ۱۹۷۷ء میں شامل ہوا۔ کتاب مقبول ہوئی اور ہندوستان و پاکستان کے متعدد اہل قلم نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے تبصروں میں اس مضمون کی بطورِ خاص نشان دہی کی۔ بعض نے تو اسے کچھ اس انداز سے حرزِ جان بنالیا کہ جب انھوں نے ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع کو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنایا تو سرقۂ خیالی اور تواردِ لفظی کی عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کیفیت کو صرف میں نے نہیں بلکہ بعض غالب شناسوں نے بھی محسوس کیا اور یہ بعض جگہ ایک طرح کی بدمزگی کا باعث بنی اس سلسلے میں ایک بدمزگی کا مختصر حال سنتے چلئے۔

اردو کے معروف نقاد جناب اسلوب احمد انصاری صاحب کو میرا مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام'' خاص طور پر پسند تھا۔ کئی خطوں میں اس کی داد دی تھی۔ چنانچہ ۲۱/اپریل ۱۹۸۶ء کے ایک خط میں بھی مجھے انھوں نے لکھا:

''مکرّمی فرمان صاحب!

السلام علیکم۔ اس سے قبل ایک خط اس غرض سے ارسال کر چکا ہوں کہ

پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب کی بیاسویں سالگرہ کے موقع پر ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں، جس میں صرف غالب اور اقبال پر مضامین ہوں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اگر غالب کی شاعری کے کسی پہلو پر، جیسا مضمون کہ آپ نے غالب کے ہاں استفہامیہ لہجے پر لکھا تھا، لکھ کر مجھے دو تین ہفتے کے اندر اندر روانہ فرمادیں تو بے حد ممنون ہوگا۔

خیر اندیش

اسلوب احمد انصاری

اس خط سے اندازہ کیجئے کہ میرا جو مضمون ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنؤ) میں چھپا تھا، اسلوب احمد انصاری صاحب کے ذہن میں کس طرح تازہ تھا۔ لیکن انھوں نے کمال کر دکھا دیا کہ بالکل اس موضوع اور عنوان کا مضمون، وہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ''غالب سیمینار'' کی ایک نشست میں پڑھنے بیٹھ گئے۔ اتفاق سے اس نشست کی صدارت مجھے سونپی گئی تھی اور اس میں ہندوستان کے اکابر ادب کے ساتھ ساتھ پاکستان کے متعدد نامور اہلِ قلم مثل ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر انور سدید بھی موجود تھے۔ حیرت کی بات یہ ہوئی اسلوب احمد انصاری صاحب نے اشارۃً وکنایۃً بھی اپنے مضموں میں میرے مضمون کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ جب مجھے نشست کے اختتام پر صدارتی کلمات کہنے کا موقع ملا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور اسلوب احمد انصاریِ کے تجاہلِ عارفانہ کی میں نے کھل کر داد دی۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے اس واقعے کو اپنے ایک مضمون مشمولہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات جلد سوم مرتبہ امراؤ طارق، کراچی ۱۹۹۴ء میں بہت قرینے سے اور قدرے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

میرے مضمون ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے سلسلے میں اسی نوعیت کا ایک توارد، جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے مضمون کے ساتھ پیش آیا تو ''اندازِ گفتگو کیا ہے'' کے زیر عنوان کتابی دنیا، دہلی، بابت ستمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے اس مضمون کو میں نے اکتوبر ۱۹۸۸ء کے نگار پاکستان میں اپنے مضمون کے دوش بدوش ادارتی نوٹ کے ساتھ دوبارہ کراچی سے شائع کیا۔ میرے اور ان کے مضمون میں جس طرح کی لفظی و معنوی ہم رنگی و مماثلت تھی اس کا بھی غالب شناسوں نے خاطر خواہ نوٹس لیا۔ متعدد خطوط آئے اور بعض نے اپنے تحقیقی و تنقیدی

مقالات میں بھی اس کا بطورِ خاص حوالہ بھی دیا۔

ممتاز غالب شناس پروفیسر سیّد معین الرحمٰن صاحب نے ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' کے زیرِ عنوان اپنے مضمون مطبوعہ و مشمولہ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری حیات و خدمات'' جلد اوّل، مطبوعہ ۱۹۹۴ء، کراچی میں لکھا۔

''غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا معلوم مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع پر ہے۔ ''غالب شاعر امروز و فردا'' میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس بیالس برس پہلے رسالہ ''نگار'' لکھنؤ شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب سے چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سرمو فرق نہیں آیا۔

کلامِ غالب کے استفہامیہ لب و لہجے کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور و فکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے رسالہ ''غالب نامہ'' دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء میں فرمان صاحب کا حوالہ دیئے بغیر ''اندازِ گفتگو کیا ہے؟'' کے عنوان سے غالب کے طرز استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' (مطبوعہ نگار، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

(تھیس ''غالب نامہ'' تجزیاتی مطالعہ، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب تحقیق و تنقید (کراچی ۱۹۶۳ء) نیز ان کی ایک دوسری بہت اہم کتاب ''غالب شاعر امروز و فردا'' (لاہور ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ ''تنقید غالب کے سو سال'' نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء) میں بھی منتخب ہوا۔

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔''

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، کہنا صرف یہ تھا کہ مجھے غالب اور کلامِ غالب سے طبعی دلچسپی

رہی ہے اور میں نے اپنے دیگر مطالعات پر مطالعۂ غالب کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ اس سلسلے کا ایک واضح نشان میری زیرِ نظر کتاب ہے جو ''غالب شاعر امروز و فردا'' کے بعد غالب پر میری دوسری کاوش کے طور پر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ غالب صدی کے بعد سے اب تک میں نے یوں تو غالب کے سلسلے میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں صرف چند مقالات شامل ہیں۔ البتہ قندِ مکرر کے طور پر ''غالب شاعر امروز و فردا'' سے بھی ایک آدھ چیزیں داخل کر دی ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مجھے غالب سے طبعی دلچسپی ہے لیکن اس میں ماحول و گرد و پیش کو بھی خاصا دخل رہا ہے چنانچہ طبعاً میں غالب کے اس دعویٰ نبوت پر۔

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

پر اس وقت ایمان لے آیا تھا، جب کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان پر لیکن ہوایوں کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعور خانے کا اہم جزو بن گئے۔ پھر جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہ نما اور مشکل کشا بن گئے۔ اگر تعلّی سے تعبیر نہ کیا جائے تو عرض کروں کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی بلکہ آغاز سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا۔ اس راہبر نے میری دنیائے قلب و ذہن کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہے اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش کہاں، مجملاً اس قدر عرض کروں گا کہ زندگی اور شعر و ادب کے باب میں جتنا کچھ میں نے غالب سے سیکھا ہے کسی اور شاعر سے نہیں سیکھا۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے۔ حمزہ کا قصہ نہیں دل گداختہ کی تفسیر ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں جزو میں کل کی نمائش ہے۔ قد و گیسو کی آرائش نہیں، دار و رسن کی آزمائش ہے۔ دشنہ و

خنجر یا بادہ و ساغر کا تذکرہ نہیں مشاہدہ حق کی گفتگو ہے۔ شعر و ادب کے سلسلے میں اس طرح کی بہت سی باتوں کا شعور و احساس ابتدا میں مجھے غالب ہی سے ملا ہے۔

فلسفۂ جذبات و کرشمہ اضداد اور زندگی و ادب کے رشتوں کے متعلق ہیگل اور میتھو آرنلڈ سے لے کر علامہ اقبال و مجنوں گورکھپوری تک، پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت اُتری جب غالب کے اس نوع کے شعر سامنے آئے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

محاکاتِ شعری اور تخیل کی گل کاری و رسائی کے بارے میں مقدمۂ شعر و شاعری اور شعر العجم میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن ذوق کی تشفی اور ذہن کی سیرابی کا سامان اس وقت میسر آیا جب غالب کے اس قسم کے اشعار نظر سے گزرے:

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

زندگی کی گہما گہمی اور کار جہاں کی درازی کی خبر دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا سچا لطف اس شعر کے بعد نصیب ہوا:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

معاشی عدم مساوات کی لعنتوں، مزدور پر سرمایہ دار کی سختیوں اور کسان پر جاگیردار کی زبردستیوں کے قصے صرف یہی نہیں کہ پڑھے یا سنے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن جب تک غالب کا درج ذیل شعر نظر سے نہ گزرا تھا افلاس و ناداری پر دولت و سرمایہ کے جبر و استبداد کا پورا احساس نہ ہوا تھا۔

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

رجائیت کے انتہا پسند مبلغوں نے زندگی کو یکسر نشاط اور قنوطیت کے ازلی طرف داروں نے اسے یکسر غم ثابت کر دکھانے کی کیا کیا نہ کوشش کی تھی لیکن جب غالب کے اس قسم کے اشعار سامنے آئے:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت، اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے دوچار ہے

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

تب اندازہ ہوا کہ فطرتِ انسانی اور لازمۂ بشریت سے دونوں بے خبر ہیں زندگی حقیقتاً ایک

سے نہیں، غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہے۔

ایجاز واختصار اور معنی خیزی ومعنی آفرینی کی تعریفیں پہلے بھی پڑھی تھیں لیکن اس قسم کے اشعار سے پہلے:

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کون ہوتا ہے حریف مئے مردِ افگن عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

یہ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کوزے میں سمندر بند کرنا کسے کہتے ہیں اور محذوفات ومقدرات، شعر کی تاثیر کس طرح بڑھا دیتے ہیں۔

حیات وکائنات اور اس کے ارتقا کے متعلق ڈارون اور دوسرے مفکرین کے توسط سے کیا کچھ نہ سن رکھا تھا لیکن یہ راز کہ غزل میں ان خیالات کا حیات افروز اور نشاط خیز مصرف کس طرح ہونا چاہئے، ذیل کے اشعار سے منکشف ہوا:

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے، اب آسماں کے لئے

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ، دائم نقاب میں

فلسفیانہ طرز فکر اور حکیمانہ اسلوب کے متعلق یہ تو سن رکھا تھا کہ ایک عظیم شاعر جو کچھ کہتا ہے، استدلال کے ساتھ کہتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے ثبوت کے ساتھ کرتا ہے، لیکن شنیدہ کو دیدہ کی حیثیت اس قسم کے اشعار کے بعد نصیب ہوئی۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ کہہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

ادبی طنز و ظرافت کے سلسلے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن اس کی لطافت و افادیت، اس وقت سمجھ میں آئی جب مرزا نوشہ کے اس نوع کے اشعار، مطالعہ میں آئے::

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

شنیدہٴ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

لفظ و معنی کے ربط باہمی پر بہت کچھ پڑھا تھا اور شاعری میں رعایت الفاظ کی حسن خیزی کے متعلق

''حدائق السحر'' سے لے کر ''المعجم'' تک بہت کچھ سمجھا تھا لیکن جب تک یہ اشعار:

شورِ پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

نظر سے نہ گزرے تھے، رعایت لفظی کو عیب کے سوا ہنر کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رجائیت اور رجائی نقطۂ نظر کے متعلق، فلسفہ ونفسیات کی بحثوں اور اقبال کے سلسلے کی کتب ومقالات میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن یہ نکتہ کہ شعروادب میں اس نقطۂ نظر کو کس سطح پر اور کس انداز سے دخیل ہونا چاہئے، غالب کے ان اشعار کے بعد سمجھ میں آیا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

بے تکلّف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

غرض کہ غالب اور کلامِ غالب نے مجھے فکروفن کے اَن گنت نکتے سجھائے ہیں اور ذہن کے نہ جانے کتنے گوشوں کو منور کیا ہے۔

اس طویل سمع خراشی کے ساتھ کتاب آپ کی نذر ہے۔ کتاب کیسی ہے، اس کا جواب مجھے نہیں آپ کو دینا ہے۔

دیباچہ ''شرح ومتن غزلیاتِ غالبؔ''

میں اپنی تحریروں میں بارہا اس بات کا اظہار کر چکا ہوں کہ غالب میرا محبوب ترین شاعر ہے، مجھے اس کے فکر ونظر سے طبعی مناسبت ہے اور میں اسے اردو کے ان چار بڑے شاعروں میں شمار کرتا ہوں جن میں غالب، اقبال، میر اور انیس کے نام آتے ہیں۔ غالب کو میں نے بوجوہ اوائل عمری سے پڑھنا شروع کیا، پھر جس قدر ممکن ہوسکا اسے پڑھتا گیا اور آج بھی میرے ذوق و شوقِ ادبی کو جو سکون و سرور غالب کے مطالعے سے میسر آتا ہے وہ کسی اور وسیلے سے کم آتا ہے۔

اب اسے غالب سے میرے والہانہ لگاؤ کا نام دے لیا جائے یا اتفاق کہہ لیا جائے کہ میرے قلم سے پہلا تنقیدی مضمون غالب ہی کے بارے میں صادر ہوا اور یہ جگہ جگہ نقل ہونے اور حوالے کی چیز بننے سے پہلے، پہلی بار جون ۱۹۵۲ء کے نگار (لکھنو) میں آج سے تقریباً اڑتالیس سال پہلے شائع ہوا۔ عنوان تھا:

''کلامِ غالب میں استفہام''

اب غور کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میرا یہ مضمون بھی شرح کلام غالب کے آثار میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ اس میں تنقید غالب کے باب میں پہلی بار یہ بات وضاحت سے زیرِ بحث لائی گئی ہے کہ قواعد اردو کے چند سادہ سے استفہامیہ کلمات مثلاً کیا، کیسے، کیوں، کس، کیونکر، کون، کہاں، وغیرہ کلامِ غالب میں مستعمل ہو کر کیسے رنگا رنگ و حیرت انگیز اور گنجینۂ معنی کا طلسم بن گئے ہیں۔ میرا یہ مضمون نہ صرف یہ کہ غالب شناسوں کے حلقے میں بلکہ اردو تنقید کے سارے حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور تنقید و تفہیم غالب کے سلسلے میں اور بجنل

(Original) فکر ونظر کا حامل خیال کیا گیا۔

بعد ازاں غالب کے بارے میں مجھ سے جو دوسرا مضمون سپردِ قلم ہوا وہ بھی اتفاق سے کلامِ غالب کی شرحوں سے متعلق تھا اور یہ بھی میری کتاب ''غالب شاعر امروز و فردا'' مطبوعہ اظہار سنز، لاہور ۱۹۶۹ء میں شامل ہونے سے قبل، پہلی بار جولائی ۱۹۵۴ء کے نگار (لکھنو) میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی اصل محرک مولانا عبدالباری آسی کی وہ شرح کلامِ غالب تھی جو رواں صدی کی پانچویں دہائی میں چھپی تھی، بہت ضخیم تھی اور اس کے بارے میں شارح نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ کلام غالب کی بہترین مکمل شرح ہے لیکن میری نظر میں یہ شرح بہت ناقص تھی اور اسی لیے میں اپنی کم علمی کے باوجود اس شرح کو موضوع تنقید بنائے بغیر نہ رہ سکا۔

میرے ان مضامین سے یہ بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ غالب شناسی کے سلسلے میں روزِ اوّل سے میرے مطالعے کا مرکزی تعلق غالب پر لکھی جانے والی کتب یا مقالات سے نہیں بلکہ براہ راست کلامِ غالب سے رہا ہے۔ اس ذوق مطالعے کے سبب سے تیس چالیس سال پہلے عام ادبی نشستوں میں بھی میری گفتگو کا محور و موضوع گھوم پھر کر، غالب اور کلامِ غالب سے متعلق ہو جاتا تھا۔ نتیجتاً میرے قریبی دوستوں کا عمومی تقاضا یہ رہتا تھا کہ میں کلامِ غالب کی کوئی شرح قلم بند کروں۔ اس سلسلے میں ممتاز غالب شناس پروفیسر ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب اور ممتاز افسانہ نگار امراؤ طارق کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق، لندن میں مقیم غالب کے پرستار اور میرے عزیز شاگرد محبوب احمد نقوی، تاج بک ڈپو لاہور کے ادب دوست ناشر و مالک جناب نوید احمد، ملتان کے ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر طاہر تونسوی، اسلامیہ یونیورسٹی بھاول پور کے پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر عقیلہ شاہین، میرے یارِ قدیم محمد عمر اور جناب محمد حبیب صدیقی (مرحوم) اور آخر آخر گورنمنٹ کالج مری کے پروفیسر عبدالعزیز ساحر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان سب کے مسلسل اصرار کے باوصف، اپنی دوسری مصروفیتوں کے سبب میرے لئے ۱۹۹۶ء سے قبل شرح دیوان غالب کے لئے وقت نکالنا ممکن نہ ہو سکا۔

۱۹۹۶ء میں اس کام کے لئے وقت کیسے مل گیا؟ اسے بھی اتفاق یا حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں مجھے ضرورتاً امریکہ جانا پڑا۔ یہاں حسب سابق میں نے اپنی بیٹی ڈاکٹر شمیم اور اپنے داماد ڈاکٹر سلمان کے ساتھ نیویارک میں قیام کیا لیکن اب کے شدید سردی کی لہر اور

طوفانی ژالہ باری نے نیویارک پر ایسا رنگ کر رکھا تھا کہ نیویارک کے مستقل باسی بھی لرزہ براندام رہنے لگے تھے۔ سردی و برف باری کے سبب میرے لئے تو نیویارک کا موسم یکسر ناقابلِ برداشت ہوگیا تھا۔ چاروناچار اپنے بیٹے ڈاکٹر سید ابصار علی کے پاس فلوریڈا کے شہر اورلینڈو میں پناہ لی۔ یہاں کی فضا نیویارک سے بہت مختلف بلکہ قدرے خوشگوار تھی۔ چنانچہ نیویارک کی سردی سے بچنے کے لئے یہاں دو مہینے قیام کیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ڈاکٹر ابصار کے گھر میں طب اور چند مذہبی کتابوں کے سوا کوئی اور کتاب نہ تھی۔ نتیجتاً صرف دیوانِ غالب مرتبہ مولانا حامد علی خاں مطبوعہ ۱۹۶۹ء لاہور، جسے میں ساتھ لے گیا تھا، میرا رفیق و دم ساز تھا۔ چند روز اس کی ورق گردانی کرنے اور غالب کے اشعار گنگنانے میں گزر گئے لیکن بعد ازاں وقت کاٹنا دوبھر ہوگیا۔ سوچا کہ فکر و حافظے کی مدد سے تنقیدی مضمون کی صورت میں کچھ لکھ ڈالوں۔ یہ بھی کر دیکھا لیکن بہ مشکل صرف دو مضمون ایک اردو خود نوشت سے متعلق، دوسرا غالب سے متعلق ہو سکے، جنہیں بعد کو اشاعت کے لئے رسائل میں بھیج دیا گیا۔

کتابوں کے بغیر وقت گزارنا کتنا بڑا عذاب ہے اس کا حقیقی اندازہ مجھے اورلینڈو کے قیام میں ہوا۔ صبح سویرے اٹھنے کی عادت نے وقت کو مزید گراں بار کر رکھا تھا اور صبح ساڑھے پانچ تا ساڑھے آٹھ بجے یعنی ناشتے سے پہلے تین گھنٹے کا وقت کاٹنا میرے لئے سخت دشوار ہوتا تھا۔ عجب طرح کا عالم عذاب تھا۔ اس عالم عذاب میں ایک دن نہ جانے کیسے یک بیک یہ بات ذہن میں آئی کہ کیوں نہ دیوانِ غالب کی شرح لکھنی شروع کر دی جائے۔ یہ خیال ایسا سکون بخش محسوس ہوا کہ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر شرح دیوان غالب کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہوگیا اور میرا سارا وقت اسی کام میں گزرنے لگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا چوں کہ دیوانِ غالب کے سوا کوئی دوسری امدادی کتاب میری دسترس میں نہ تھی اس لئے میرا ذہن بعض اشعار کی تفہیم و تشریح میں بڑی الجھن محسوس کرتا تھا پھر بھی میں بار بار غور کر کے اطمینان بخش تفہیم تک رسائی حاصل کر لینے کی کوشش کرتا تھا۔ اب خدا جانے یہ شرح دوسروں کے لئے بھی اطمینان بخش ثابت ہوگی یا نہیں لیکن چند وجوہ سے یہ کام میرے اپنے لئے نہ صرف یہ کہ سکون بخش رہا بلکہ ذہن و فکر کو ایک طرح کی توانائی بخشنے کا وسیلہ بھی بنا۔ اوّل اس لئے کہ اس طرح مجھے دیوانِ غالب کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شعر کو بالاستیعاب

پڑھنے اور سمجھنے کا موقع مل گیا اور کلامِ غالب کے درجنوں مقامات جو اس سے پہلے مجھے گنجلک محسوس ہو رہے تھے ذہن میں واضح ہو گئے۔ دوم اس لئے کہ اس مشرح مطالعے سے غالب کے ارتقائے ذہنی کے کئی ایسے گوشے میرے سامنے آ گئے جو اس سے پہلے میری نگاہ سے پوشیدہ تھے اس لئے کہ بعض اشعار مثلاً

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

یا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

جو پہلے پیچیدہ اور مہمل محسوس ہوتے تھے بار بار ذاتی غور و فکر کے بعد نہ صرف بامعنی بلکہ نہایت فکر انگیز اور تہہ دار محسوس ہونے لگے۔

سوم اس لئے کہ دیوانِ غالب کے باقاعدہ اور مسلسل مطالعے سے غالب کا وہ تنقیدی و خود احتسابی ذہن بھی سامنے آ گیا جس نے ان سے اپنے کلام کی کاٹ چھانٹ کرائی اور کچھ ایسی کاٹ چھانٹ کرائی کہ غالب کی ساری غزلیں خواہ طرحی ہوں یا غیر طرحی اپنے ہمعصر شعراء کے مقابلے میں حد درجہ مختصر ہو کر رہ گئیں اور یہ انکشاف مجھ پر پہلی بار ہوا کہ

(۱) ان کی طویل سے طویل غزل صرف سولہ یا سترہ اشعار کی ہے اور یہ بھی تعداد میں صرف ایک ایک ہیں۔

(۲) بیس کے قریب ان کی غزلیں یک شعری ہیں یعنی ان میں سے ہر غزل صرف ایک شعر کی حامل ہے۔

(۳) کم و بیش تیس غزلیں صرف دو دو شعر کی اور پچیس غزلیں صرف تین تین شعروں کی ہیں۔

غزلوں کے اس اختصار و قطع برید سے پہلے ان کی کیا صورت تھی اور ان میں سے ہر ایک کے کتنے کتنے اشعار قلم زد کر دیئے گئے اور کیوں؟ ان سوالوں کے جوابات کے لئے وقت بھی چاہیے اور

تفصیل بھی۔ انشاءاللہ بہت جلد یہ مقالات کی صورت میں قارئین کی نظر سے گزریں گی۔ سردست شرح غالب پر نظر ڈالنے کی درخواست ہے جو اس وقت بہ عنوان ''معانی ومطالب مع غزلیات غالب'' آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کی نگاہ میں یہ شرح کیسی ہے؟ یہ آپ جانیں۔ البتہ جیسا کہ دوچار غزلوں کی شرح دیکھنے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی اس کے بارے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس میں کوئی خوبی یا خصوصیت ہو یا نہ ہو لیکن میرے زاویہ نظر سے یہ شرح، تفہیم و تشریح کے باب میں خود کفیل ضرور ہے یعنی اس کے مطالعے سے عام قاری کے ذہن کی تشفی ہو جانی چاہئیے اور اس کے لئے ادھر ادھر مزید بھٹکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

ہر چند کہ یہ شرح کم سے کم الفاظ میں لکھی گئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کا ایک ایک شعر بہ اعتبار مفہوم پوری طرح مشرح ہے اور اس پر بے جا اختصار یا بے جا طوالت کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عموماً اسی عیب نے غالب کی بعض دوسری شرحوں کو ناقص بنا دیا ہے اور میری نظروں میں شارحین غالب کا یہی پہلو کھٹکتا رہا ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی جیسے رموز فن سے آگاہ اور نکاتِ کلامِ غالب سے آشنا، شارحین غالب، اب کہاں پیدا ہوں گے لیکن اختصار نویسی کے سبب ان کی شرحیں وہ غرض پوری نہ کر سکیں جس کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اسی طرح کا عیب شاداں بلگرامی اور مولانا عبدالباری آسی کی شرحوں میں ہے۔ ان بزرگوں نے شرح غالب کے سلسلے میں ایک جگہ نہیں جگہ جگہ ایسی بے جا طوالت اور غیر ضروری تشریحات سے کام لیا ہے کہ قاری کے لئے غالب کا شعر آسان ہو جانے کے بجائے کچھ اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔ بعض شارحین نے اپنی طرف سے تو بہت کم لکھا البتہ دوسری شرحوں سے ایک ایک شعر کی درجنوں بامعنی اور بے معنی تشریحات نقل کر کے شعر غالب کو سہل کرنے کے بجائے گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ آغا محمد باقر اور بعض دوسروں کی شرحیں اسی قبیل کی ہیں اور دراصل بحیثیت مجموع شروح کلامِ غالب کی یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کے سبب میں کبھی ان کی طرف سے مطمئن نہ ہو سکا اور یہی بے اطمینانی میرے لئے ایک اور شرح غالب کا جواز بن گئی۔

ورنہ ابتداء میں شرح کو مدلل بنانے کے لئے میں بھی خاصی تفصیلات میں چلا گیا تھا مثلاً

غالب کے اس شعر کی:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

شرح اس طور پر لکھی:

''بظاہر یوں لگتا ہے کہ جیسے اس شعر میں شاعر نے اپنے شعری ڈکشن کے بارے میں محض شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرے نزدیک غالب نے اپنے اس شعر کے ذریعے شاعری میں استعمال ہونے والے الفاظ کی رنگارنگی اور معنوی تہہ داری کی عمومی کیفیت کی جانب توجہ دلائی ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں ''مرے'' کی ضمیر صرف غالب کی نہیں بلکہ شاعروں کی پوری جماعت کی ترجمان ہے۔

غالب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شعر میں استعمال ہونے والا کوئی لفظ، سادہ یا سپلٹ نہیں ہوتا بلکہ اپنے اندر ایک طلسمی کیفیت رکھتا ہے اور طلسم اسے کہتے ہیں جو اپنی ظاہری و معنوی سحر انگیزی سے ذہن کو سحر زدہ کر دیتا ہو۔ شعر میں استعمال ہونے والا کوئی لفظ اس لئے بھی طلسماتی ہوتا ہے کہ وہ بہ اعتبار لغت اگرچہ معنی واحد کا ترجمان یا نمائندہ ہوتا ہے لیکن جب یہی لفظ شعر میں جگہ پاتا ہے تو دوسرے الفاظ سے منسلک اور ہم آہنگ ہو کر، معنی کے متعدد رنگوں کو جنم دیتا ہے۔ یہ سارے رنگ قاری یا سامع پر بیک وقت نہیں کھلتے بلکہ تادیر مطالعے میں رہنے کے بعد وقتاً فوقتاً بے نقاب ہوتے ہیں اور شاعر کی ذہنی ذنفسی کیفیات کے مطابق اپنے معنوی منصب میں تبدیلی پیدا کر کے بلحاظ اثر و تاثیر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں اور ان کا یہی کچھ سے کچھ ہو جانا دراصل گنجینۂ معنی کا طلسم ہوتا ہے۔

اپنے سیاق وسباق کی مدد سے لفظ کی یہی تبدیلی ہے جو اس کی تاثیری کیفیت کو منجمد یا زمان و مکاں میں مقید نہیں ہونے دیتی بلکہ سیال و رواں دواں رکھتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی خاص ماحول اور کسی خاص عہد میں کہا گیا شعر نہ تو صدیوں تک زندہ رہتا اور نہ اس میں وہ معنوی عمومیت پیدا ہوتی جو نسل و رنگ اور فضا و ماحول سے بالاتر رہ کر ذہن انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تلخیص اس بحث کی یہ ہے کہ شعر میں استعمال ہونے والا لفظ عموماً اکہرا اور سادہ نہیں بلکہ تہہ در تہہ اور طلسم

افروز ہوتا ہے۔ شعر میں لفظ کی تہہ داری و طلسم سازی کا یہ کوئی ایسا تصور نہیں جس کا ادراک آج سے پہلے نہ کیا گیا ہو۔ علم بیان و بدیع کے عالموں نے لفظ کی اس طلسم سازی کو مجازی معنی کی بحث میں موضوع گفتگو بنایا ہے لیکن پچھلی چند دھائیوں میں ساختیات و پس ساختیات کے مباحث کی معرفت اس کا ادراک جتنا واضح اور عام ہوا ہے اس سے پہلے نہ ہوا تھا۔ عموماً کسی خاص شعر میں کسی لفظ کے ذو معنین یا الہامی ہونے پر بحث تو کی جاتی تھی لیکن کسی لفظ کو مختلف شعروں کے حوالے سے الفاظ کے مختلف گروہوں میں رکھ کر اس کے اندر پوشیدہ دوسرے معنوں کی طرف توجہ دلانے کا رواج نہ ہوا تھا۔ اس جانب توجہ دلانے کا سہرا حقیقتاً آج کے تنقید نگاروں پر ہے۔ البتہ غالب کے ذہن میں لفظ کی معنوی تہہ داری کا یہی تصور تھا جس کے تحت انہوں نے شعر میں استعمال ہونے والے لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے متعدد اشعار کے ذریعے لفظ کے طلسم ساز ہونے کا واضح ثبوت بھی فراہم کیا ہے اور مولانا حالی کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے ناقدوں نے ایہام و ابہام کے عنوان سے اس کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ کلام غالب کو اس خاص رخ سے دیکھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا۔

غالب کے مذکورہ بالا شعر میں ''طلسم'' کا لفظ بطور خاص اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ شعر چوں کہ فکر و خیال اور جذبہ و احساس کو ایک ساتھ گوندھنے اور الفاظ کے خاص رشتے میں پرونے سے جنم لیتا ہے اور یہ سارا عمل سادہ نہیں پیچیدہ ہوتا ہے اس لئے اپنی تفہیم و تحسین کے لیے الفاظ کی بنت اور اس بنت کی عناعی سے گہری شناسائی و واقفیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک اچھے، جان دار، فکر انگیز اور تادیر زندہ رہنے والے شعر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک جہان معنی پوشیدہ رکھتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر خود غالب کے لفظوں میں یہ آرٹ کا نمونہ نہیں بلکہ لڑکوں کا کھیل ہے، خود کہتے ہیں:

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

الفاظ کے ذریعے قطرے میں دریا اور جزو میں کل کو دیکھنے دکھانے کا یہ طلسماتی عمل جس کا دوسرا نام شعر ہے قاری یا سامع کے لئے ایک طرح کا قفل ابجد ہوتا ہے۔ اس قفل ابجد کو کھولنے اور اس کے طلسم سے واقف و لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شعر کا قاری اور سامع باشعور و

سخن

باذوق ہونے کے ساتھ ساتھ لفظ کی معنیاتی سطحوں، اس کے روایتی و ثقافتی رنگوں کے باہمی رشتوں، صوتی کیفیتوں اور غنائی آہنگوں کا ادراک بھی رکھتا ہو۔ اس کا یہ ادراک ہی لفظوں کی گرہیں کھول سکتا ہے اور ان گرہوں کا کھلنا ہی حقیقتاً شعر کے قفل ابجد یا اس کے طلسم کا کھلنا ہے۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ شاعری میں لفظ کی اہمیت معمولی نہیں غیر معمولی ہے اور فکر و خیال کی ساری گہرائیاں اور بلند پائیاں، لفظ ہی کے طلسم و سحر کاری کی معرفت ہم تک پہنچتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شعر کی تخلیق و تفہیم دونوں کا منبع اوّل و آخر لفظ اور صرف لفظ ہے۔ چنانچہ جس شخص کی رسائی لفظ کے کنبہ تک نہیں وہ نہ تو اچھا شعر کہہ سکتا ہے اور نہ شعر کی تفہیم و تحسین کا کماحقہ دعویٰ کر سکتا ہے۔

اشعار کی تشریحات کو طوالت سے بچانے کے لئے میں نے مذکورہ بالا وضاحتی انداز سے گریز کیا ہے جسے مولانا حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ''محاسنِ کلامِ غالب'' میں یا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ''فکر اقبال'' اور شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شور انگیز'' میں اپنایا ہے۔ پھر بھی میں غالب سے اپنے غیر معمولی وابستگی کے سبب غالب کے اشعار کی تشریح میں کچھ ایسا ڈوب جاتا تھا اور اس کے لفظی و معنوی محاسن کی توضیح کچھ اس انداز سے کرنے لگتا تھا کہ شرح کی حدوں سے آگے بڑھ کر میرا قلم اور میری تحریر تاثراتی تنقید کے دائرے میں داخل ہو جاتی تھی۔

ایسے موقعوں پر میں تلمیحات کی وضاحتوں اور کنایات و استعارات کی تصریحات کو اپنی تشریحات سے شعوری طور پر خارج کر کے اور تنقیدی روش کو ترک کر کے، کم سے کم لفظوں میں اپنی بات مکمل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کوشش میں ممکن ہے کہ بعض اشعار کی شرح قاری کے زاویۂ نظر سے خام رہ گئی ہو، لیکن شعر کی مطلب نگاری کے سلسلے میں علم بیان و بدیع کی لمبی لمبی بحثیں چھیڑنا اور تشریح کو تنقید بنانا مجھے اچھا نہیں لگا۔ حتی الوسع میں نے شرح کو بس شرح کی حدود میں رہنے دیا ہے۔

محاسنِ شعری سے صرفِ نظر کر کے سیدھے سادے اور مختصر لفظوں میں محض شعر کے مفہوم کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش میں مجھے اپنے اوپر ایک اور جبر کرنا پڑا ہے اور وہ جبر یہ تھا کہ اسی مفہوم کے حامل دوسرے اشعار خواہ وہ خود غالب کے ہوں یا اردو فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے،

مثالاً درج کرنے سے گریز کیا۔ اس گریز کو میں نے جبر کا نام یوں دیا ہے کہ شاعری میری کمزوری ہے اور میرے ذہن میں بحمد للہ، شعر اتنی کثرت سے محفوظ ہیں کہ معنوی اعتبار سے منفرد سے منفرد شعر کے ہم معنی شعر ذہن میں ابھر آتے ہیں اور میں بعض اوقات خواہ مخواہ ان کے محاسن و معائب کا تقابلی جائزہ لینے لگتا ہوں۔

اس تقابلی جائزے میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ تنقیدی مباحث پھیلتے چلے جاتے ہیں اور غالب کے شعر کا اصل مفہوم الگ رکھا رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریق کار شرح غالب کے سلسلے میں مناسب نہ ہوتا۔ شرح کا قاری، اس بحث کو معلومات افزا تو جانتا اور حسب توفیق اس سے لطف اندوز بھی ہوتا لیکن شرح کا اصل مقصد، شاید حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے میں نے عموماً سروکار، اس بات سے رکھا ہے کہ قاری کا ذہن براہِ راست غالب کے شعر اور اس کے مفہوم سے وابستہ رہے۔

آخر میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جب پریس بھجوانے کی غرض سے میں اس شرح کا مبیضہ تیار کروانے لگا تو پورے مسودے پر نظر ثانی کی اور اس نظر ثانی کے سلسلے میں علی گڑھ کے سعید الدین احمد کی شرح مطبوعہ ۱۹۲۶ء سے بطور خاص مدد لی۔ اس لیے کہ میری نظر میں یہ شرح دوسری شرحوں سے بہتر ہے اور ایک مدت سے یعنی ہائی اسکول کے زمانہ طالب علمی سے میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۶ رستمبر ۱۹۹۹ء

''تعبیراتِ غالبؔ'' کا دیباچہ

میری زیرِنظر کتاب ''تعبیراتِ غالب'' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، غالب اور کلام غالب کی چند تعبیرات سے متعلق ہے۔ غالبؔ، اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک نابغۂ روزگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نابغہ، عربی کا لفظ ہے اور انگریزی کے لفظ جینیس کے ترجمہ و متبادل کے طور پر اُردو میں مستعمل ہے۔

انگریزی میں جینیس یا نابغہ، غیر معمولی فطانت اور تخلیقی قوت رکھنے والے شخص کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے مطابق جینیس حد درجہ طاقتور ذہن یا دماغ کا مالک ہوتا ہے اور جینیس قسم کے لوگوں میں ایک قدر مشترک یہ ہوتی ہے کہ روش عام سے ہٹ کر چلنے اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کا زبردست رجحان واحساس رکھتے ہیں، اُن کی طبیعت عموماً حد و سمت کی پابند نہیں ہوتی بلکہ وہ جس راہ پر بھی چل پڑتے ہیں، اس میں اپنا ایک واضح نشان بنا لیتے ہیں۔ اُن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خودنگر و حساس ہوتے ہیں۔ روش عام پر چلنے سے گریز اور انا پرستی کا عنصر ان میں نہایت قوی ہوتا ہے۔

جینیس کی یہ بنیادی صفات، میرے مطالعے کے مطابق غالب میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور اسی لیے وہ اُردو فارسی نثر و نظم کی جن اصناف کی طرف بھی چل پڑے، سب میں اپنا ایک امتیازی نشان بنا لیا۔ تہذیبی و معاشرتی زندگی توجیہ و تفہیم کے باب میں بھی اُن کی یہی روش رہی۔ انھوں نے اپنے عہد کے سارے سیاسی و سماجی روّیوں سے خود کو مربوط رکھا اور اپنی شاعری کو زندگی کی تعبیرات کے سلسلے میں ایک ایسا مرقع بنا دیا کہ اُس میں صف اوّل کے سارے اُردو شعرا کی

تعبیرات سما گئیں۔ ان تعبیروں میں ولی دکنی، میر و سودا، آتش و ناسخ، مومن و حسرت، شاد و فانی، اصغر و جگر اور یگانہ و اقبال، غرض کہ جملہ ممتاز شعرا کے فکر و فن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، گویا غالب کی شاعری، ایک خاص سطح پر ان سب کی ترجمانی و نمائندگی کرتی ہے اور اس اندازِ خاص سے کرتی ہے کہ ہمیں غالب کو اُردو کا نابغۂ روزگار شاعر کہنا پڑتا ہے۔

غالب ژرف نگاہی یا تعبیری بصیرت صرف ماضی و حال تک محدود نہ تھی بلکہ وہ اپنے بعد، آنے والے اُس عہد کو بھی دیکھ رہی تھی جو مغربی علوم و فنون کی تازہ قوتوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور جس کی تیز روشنی، مشرقی کی آنکھ کو بہت جلد خیرہ کرنے والی تھی۔ غالب کی اس دیدہ وری اور مستقبل بینی کے نتیجے میں ان کی شاعری تعبیراتِ حیات کا ایسا مرقع بن گئی جس کی تفہیم و تفسیر میں اُردو کے ناقدین تقریباً دو سو سال سے لگے ہوئے ہیں مگر اپنی کاوشوں سے نہ تو وہ خود کو مطمئن کر سکے اور نہ دوسروں کو۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان کی تعبیریں، کلام غالب کی مزید تعبیروں کے لیے جواز پیدا کرتی گئیں۔ زیرِ نظر کتاب ''تعبیراتِ غالب'' انھی تعبیرات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب محترمہ بیگم آمنہ مجید ملک صاحبہ کی خصوصی توجہ اور ادارۂ یادگارِ غالب کے اہتمام خاص کے ساتھ منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ میں دونوں کا شکر گزار و ممنونِ احسان ہوں۔

کراچی، ۲۳؍اپریل ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالبؔ سے متعلق مضامین

غالبؔ اور محاسنِ کلامِ غالبؔ

''محاسنِ کلامِ غالب'' اُردو کے نامور ادیب و نقاد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے صرف ۳۳ سال کی (۱۹۱۸-۱۸۸۵ء) عمر پائی پھر بھی، اُردو ادب کو بعض ایسی قیمتی تحریریں دے گئے جن کی معرفت وہ ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ شاعروں میں تو خیر بعض ایسے ہیں جو تیس بتیس سال کی عمر میں بھی اپنا قابلِ ذکر نشان چھوڑ گئے۔ میری مراد اُردو میں دیا شنکر نسیم، مجاز لکھنوی، اختر شیرانی وغیرہ سے ہے، لیکن نثر میں ڈاکٹر بجنوری کے سوا کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر بجنوری ایک نابغۂ روزگار تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب قدرِ اوّل کی تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے جیسا کہ اُن کی متفرق تحریروں کے مجموعے ''باقیاتِ بجنوری'' سے پتا چلتا ہے، انھوں نے خطوط بھی لکھے ہیں، ترجمے بھی کئے ہیں اور بعض علمی مضامین بھی قلم بند کئے ہیں لیکن ان سب سے قطع نظر، اُردو میں ان کے دو بہت بڑے حوالے ہیں، ایک حوالہ انیسویں صدی کے بے مثال شاعر غالبؔ کے تعلق سے ہے اور دوسرا حوالہ بیسویں صدی کے عظیم شاعر علامہ اقبالؔ کی نسبت سے۔ اس وقت ڈاکٹر بجنوری کے بارے میں انہی دو حوالوں کی روشنی میں مختصراً کچھ عرض کیا جائے گا۔

غالب کے تعلق سے ڈاکٹر بجنوری کا پہلا حوالہ، اُن کا وہ مقالہ ہے جو ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے نام سے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں لکھا گیا۔ پہلے انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی ترجمان ''اُردو ادب'' میں شائع ہوا اور بعد کو بطورِ مقدمہ ''دیوانِ غالب'' ''نسخۂ حمیدیہ'' مطبوعہ بھوپال ۱۹۲۱ء کی زینت بنا۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' سے مراد غالب کے اُردو دیوان کا وہ قدم ترین نسخہ ہے جسے خود غالب نے بہ عمر ۲۴ سال ردیف وار مرتب کیا تھا اور جس میں حذف و ترمیم کے بعد اُن کا منتخب کلام موجودہ اُردو دیوان کی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ موجودہ دیوان ان کی زندگی میں بھی کئی بار چھپا۔ پہلی بار ۱۸۴۱ء مطابق ۱۲۵۷ھ میں مطبع سیدالاخبار دہلی سے، دوسری بار ۱۸۴۷ء/ ۱۲۶۳ھ میں مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی سے، تیسری بار ۱۸۶۱ء/ ۱۲۸۷ھ میں مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی سے، چوتھی بار ۱۸۶۲ء/ ۱۲۷۹ھ میں مطبع نظامی بدایوں سے اور پانچویں بار ۱۸۶۳ء/ ۱۲۸۰ھ میں مطبع مفید خلائق آگرہ سے۔

مرزا نوشہ کی وفات کے بعد بھی اُن کے مروّجہ یا موجودہ دیوان کے اچھے بُرے درجنوں ایڈیشن مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے لیکن ان سب کا منبع و ماخذ اور تاریخی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہم اُن کا وہ اُردو دیوان ہے جسے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے نام سے مفتی انوارالحق نے ۱۹۲۱ء میں مرتب کر کے بھوپال سے شائع کیا۔ اس میں بطورِ مقدمہ ڈاکٹر بجنوری کا وہ مقالہ بھی شامل ہے جو ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے عنوان سے کئی بار الگ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔ یہی مقالہ یا مقدمہ ''نسخۂ حمیدیہ'' کے تعلق سے ہمارے نقادوں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا۔ بعض نے اسے غالب کی غیر مدلّل مدّاحی کا نام دیا اور بعض نے بجنوری کی تعریف میں محض غُلو قرار دیا۔ ڈاکٹر بجنوری کے مقدمے کے ابتدائی فقروں نے بطورِ خاص شہرت پائی اور بعض ناقدین کی ناگواری طبع کا باعث ہوئے۔ وہ فقرے یہ ہیں:

> ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدّس وید اور دیوانِ غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔''

(نسخۂ حمیدیہ، مطبوعہ بھوپال، ۱۹۲۱ء، ص ۳۳)

یہ فقرے جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اُردو کے بعض ادیبوں اور نقادوں کو سخت ناگوار گزرے، چنانچہ ان

فقروں کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر بجنوری پر ایک عرصے تک لعن طعن کی جاتی رہی۔ حالانکہ یہ لعن طعن محض لاعلمی اور بے خبری پر مبنی تھی۔ اپنے فقروں میں ڈاکٹر بجنوری نے الہامی کتابوں کے حوالے سے دیوانِ غالب کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اساسی طور پر ڈاکٹر بجنوری کی نہیں بلکہ خود غالب کی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اپنے وجدانی فقروں میں صرف غالب کی موثر اور خوبصورت ترجمانی کردی ہے اور بجنوری کے نام پر ایک نعرۂ مستانہ لگا دیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے ان جملوں پر تنقید کرنے والوں نے جانے کیوں غالب کی اس فارسی رباعی کو ذہن میں نہیں رکھا جس میں اُنھوں نے خود اپنے اُردو دیوان کو ''کتابِ ایزدی'' کہا ہے اور جو ڈاکٹر بجنوری کے مقالے ''محاسنِ کلامِ غالب'' کی پیشانی پر بھی درج ہے۔ یہ رباعی سنتے چلیے:

گر شعر و سخن بہ دہر آئیں بودے
دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آن دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ڈاکٹر بجنوری اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے اُردو میں تقابلی تنقید کی بنا ڈالی اور غالب کو دنیا کے مختلف زبانوں کے بڑے شاعروں کے مقابل رکھ کر ان کے فکر و نظر اور فنّی کمالات کی غیر معمولی رسائی پر روشنی ڈالی۔ بجنوری نے پہلی بار ہمیں اس بات کا احساس دلایا کہ غالب ایک چھوٹی زبان کا شاعر ہو کر بھی بہت بڑا شاعر ہے اور اس کا شاعرانہ مقام دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم تر درجے کا نہیں ہے۔ بقول بجنوری، غالب کی سوچ فلسفیانہ ہے اور اس نے اپنی اس فلسفیانہ سوچ کو شعر کے قالب میں ڈھال کر کمالِ فن کی معراج حاصل کرلی ہے۔ یہی وہ معراجِ فکر و فن ہے جس کی بنا پر ہمارے اکثر نقاد غالب کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان میں سے بعض نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں کلامِ غالب کو مہمل و خرافات قرار دیا۔ اس کی ایک مثال ڈاکٹر عبداللطیف کی وہ کتاب ہے جو پہلے ۱۹۲۸ء میں بزبانِ انگریزی شائع ہوئی پھر ۱۹۳۲ء میں اُردو میں چھپی۔ آج اس طرح کی ساری تحریریں جو ڈاکٹر بجنوری کے مقالہ ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے جواب میں یا اُن کے خیالات کے رد میں لکھی گئیں۔ غیر مقبول اور بے معنی ہو گئی ہیں جب کہ ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ اور غالب کی شاعری کے بارے میں اُن کے خیالات کی گونج سارے علمی و ادبی حلقوں میں سنائی

دیتی ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ غالب کو ان دنوں ڈاکٹر بجنوری کے بیان کردہ محاسنِ فن کی روشنی ہی میں جانچنے پرکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اُردو میں ڈاکٹر بجنوری کا دوسرا اہم حوالہ ان کا وہ انگریزی مضمون ہے جوانھوں نے علامہ اقبال کے فکروفن کی تائید میں لکھا اور جو ڈاکٹر بجنوری کی زندگی میں انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (East & West) میں شائع ہوا۔ بعد کو اُردو کے نامور محقق مالک رام نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ ۱۹۳۲ء میں رسالہ ''نیرنگِ خیال'' کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔

اس مضمون کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء میں جب علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' پہلی بار شائع ہوئی تو اس کے بعض مندرجات کے خلاف بڑا شوروغوغا بلند ہوا۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ''اسرارِخودی'' علامہ کی پہلی منضبط تصنیف ہے اور اس میں علامہ نے اپنے فلسفۂ خودی کی توضیح کرتے ہوئے اپنے فکروفن کا رُخ متعین کیا ہے اور علامہ اسی کتاب کی بدولت پہلے پہل دنیا کے سامنے ایک چونکا دینے والے شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

اس مثنوی کی نثری تمہید اور حافظ شیرازی کے بارے میں اس کے بعض ابتدائی اشعار، علم و ادب کے بعض اکابر کی ناراضگی کا سبب ہوئے۔ وہ ابتدائی اشعار یہ تھے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار	جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
آں فقیہِ ملّتِ مے خوارگاں	آں امامِ اُمتِ بے چارگاں
گوسفند و نوا آموخت است	عشوہ و ناز و ادا آموخت است
در رموزِ عشق و مستی کاملے	از خمِ خوں دَر دِلے یا دَر گِلے
بے نیاز از محفلِ حافظ گزر	الحذر از گوسفنداں الحذر

حتیٰ کہ خواجہ حسن نظامی اور اکبرالٰہ آبادی جیسے صاحبِ نظر علامہ دوستوں نے بھی فکرِ اقبال کی مخالفت میں آواز بلند کی۔ اس آواز کا ردّ علامہ کے پاس موجود تھا لیکن اُنھوں نے اس وقت دوسرے سارے کام چھوڑ کر لاحاصل بحث میں پڑنا پسند نہ کیا۔ البتہ ''اسرارِخودی'' کی دوسری اشاعت میں اس کی تمہید اور حافظ شیرازی سے متعلق اشعار کو مثنوی سے خارج کر دیا۔ لیکن بعض اہلِ نظر نے علامہ کے خیالات کی مخالفت کے جواب میں خاموش رہنا پسند نہ کیا اور علمی دلائل کے ساتھ اقبال کی تائید میں گراں قدر مقالے لکھے۔ ان مقالہ نگاروں میں مولانا اسلم جیراجپوری اور

ڈاکٹر بجنوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ اقبال کے خیالات کی تائید میں ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ فلسفیانہ نکات سے معمور اور عالمانہ تجزیوں سے بھرپور اُسی انداز کا ہے جیسا کہ ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے عنوان سے اُنھوں نے ''نسخۂ حمیدیہ'' کے مقدمے میں لکھا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، ڈاکٹر بجنوری کا یہ مقالہ پہلے شملہ کے انگریزی رسالہ ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' میں چھپا بعد کو مالک رام کے ذریعے اُردو میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر اقبال نے ڈاکٹر بجنوری کے مضمون کو پسند کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا:

> ''رسالہ 'ایسٹ اینڈ ویسٹ' انگریزی کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری صاحب نے ایک ریویو دونوں مثنویوں پر نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو ارسالِ خدمت کروں گا۔''

بعد ازاں خود علامہ اقبال نے کھل کر اپنے خطوط و مقالات میں اپنے فلسفۂ خودی اور اپنے مثبت متصوفانہ روّیوں کی صراحت و تائید میں بہت کچھ لکھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دراصل ڈاکٹر بجنوری کا مقالہ تھا جس نے اقبال کی مخالفت میں اُڑائی ہوئی گرد کو پوری طرح بٹھال دیا اور چونکہ اُن کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کو ان کے فلسفۂ حیات میں اساسی حیثیت حاصل تھی اس لیے جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں اس مثنوی کی اہمیت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی کی تشریح و تفہیم کے لیے اُردو میں متعدد کتابیں اور سیکڑوں مقالے شائع ہوئے۔ انگریزی اور اُردو کے ساتھ ساتھ دنیا کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا لیکن اس کی موافقت و تحسین میں پہلا مدلّل و مبسوط مقالہ ڈاکٹر بجنوری کا ہے۔

اب اس پس منظر میں دیکھیے تو کہنا پڑے گا کہ ڈاکٹر بجنوری اُردو کے اوّلین بالغ نظر و باشعور اور وسیع المطالعہ نقاد ہیں جن کے قلم نے اُردو کے دو بے مثال نابغہ شاعروں، اسداللہ خاں غالبؔ اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؔ کو مثبت انداز میں ہم سے متعارف کرایا اور اس طرح تقابلی تنقید کی ایک تازہ راہ اُردو کو دکھادی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کے بارے میں غالبؔ اور اقبالؔ کے تعلق سے اوپر جو ذکر آیا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں اور ان کی جانب ہمارے ناقدین و

محققین کو ضرور رجوع کرنا چاہیے تاکہ اصل حقائق سامنے آ جائیں اور ڈاکٹر بجنوری کی باتوں کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جائے۔ غالب کے تعلق سے قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بجنوری کا جو مقالہ بہ عنوان بطور مقدمہ بہ عنوان ''محاسنِ کلامِ غالب'' نسخۂ حمیدیہ مرتبہ مفتی انوار الحق مطبوعہ بھوپال ۱۹۲۱ء میں شامل ہے، اس کا تکملہ یا اختتام غالب کے اس شعر پر ہوتا ہے۔

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد　　آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ

لیکن ۱۹۲۱ء کے رسالہ ''اُردو'' میں بجنوری کا جو مقالہ بہ عنوان ''محاسنِ کلامِ غالب'' شائع ہوا ہے اور بعد میں بھی کئی بار کتابی صورت میں چھپا ہے، وہ نسخۂ حمیدیہ میں شامل مقالے کے مقابلے میں قدرے طویل ہے یعنی کم از کم چھ صفحے کا مواد زاید ہے اور اس کا خاتمہ درج ذیل فقرے پر ہوتا ہے۔

> ''غالبؔ نے حقیقت میں ورجل ۔۔۔(Virgil) کو بھی، جس کی نظم ''کنارِ دریا'' کے متعلق مشہور ہے، مات کر دیا ہے۔''

یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں طبع شدہ مقالوں میں یہ کمی بیشی آخر کیوں ہے اور اُسی کے ساتھ یہ سوالات بھی ذہن میں اُبھرتے ہیں کہ یہ ترمیم و تنسیخ یا اضافہ یا کمی بیشی کب ہوئی، کس پس منظر میں ہوئی اور کن محرکات کے تحت ہوئی؟

اُردو میں ڈاکٹر بجنوری کا دوسرا اہم حوالہ علامہ شیخ محمد اقبال سے متعلق ہے۔ اُس کے سلسلے میں بھی بعض باتیں تحقیق طلب ہیں۔ یہ تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' مطبوعہ ۱۹۱۵ء کے بارے میں ڈاکٹر بجنوری ''بزبانِ انگریزی'' ایک مقالہ لکھا تھا، اور یہ پہلے پہل انگریزی رسالہ ''ایسٹ اینڈ ویسٹ'' میں ۱۹۱۸ء میں چھپا تھا۔ بعد میں مالک رام نے اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان کا ترجمہ ''نیرنگِ خیال'' بابت ۱۹۳۲ء کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ بجنوری کے انگریزی مضمون میں علامہ اقبال کی ''اسرار اور رموز'' دونوں مثنویوں کا ذکر ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ علامہ اقبال کی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' کی اشاعت اور بجنوری کی وفات، دونوں کا سال ۱۹۱۸ء ہے۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ ڈاکٹر بجنوری کے مضمون میں ''رموز'' کا بھی تذکرہ آ گیا۔ اس امر پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ ورنہ یہ مسئلہ اقبال اور بجنوری دونوں کے حوالے سے ادب کے قارئین کے ذہنوں میں اُلجھاؤ کا سبب بنا رہے گا۔

آسی کی شرح دیوانِ غالب

مولانا آسی لکھنوی کی شرح دیوانِ غالب تمام موجودہ تبصروں اور شرحوں سے ضخیم ہے۔ اس میں بیس صفحات کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں شیفتہ، مومن اور ذوق کی زندگی و شاعری کا غالب سے موازنہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں غالب کے ان اشعار کی فہرست ہے جو انھوں نے فارسی سے ترجمہ کئے ہیں۔ تیسرے حصہ میں غالب کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شرحوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے معائب و محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان تبصروں اور شرحوں میں حالی کی ''یادگارِ غالب'' علامہ بجنوری کی ''محاسنِ کلامِ غالب'' اور حسرت موہانی و نظم طباطبائی کی شرحیں بھی شامل ہیں۔۔۔ آسی صاحب نے ان شرحوں کی بے بضاعتی، غلط مطلب نگاری، بے جا طوالت اور بے محل اختصار پر اظہار تاسف کیا ہے اور یہی چیز ''مکمل شرح دیوانِ غالب'' کی تصنیف کا سبب ہوئی۔

یہ شرح باعتبار جسامت دوسری شرحوں سے بھاری بھرکم ضرور ہے لیکن نہ ان معائب سے پاک ہے جو آسی صاحب دوسری شرحوں میں پاتے ہیں اور نہ وہ مطالب کی صحت کے اعتبار سے حسرت موہانی اور نظم طباطبائی کی شرحوں سے بہتر ہے۔ آسی صاحب کہیں کہیں تو سہل ممتنع کے اشعار کی مطلب نگاری سے بھی پوری طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکے۔

عرصہ ہوا مولانا عبدالحق اور مولانا حامد حسن قادری اس شرح پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اکثر مطالب کی صحت کر چکے ہیں۔ پھر بھی بعض دوسرے مطالب صحت طلب ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آسی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔"جس جنگل میں وحشت میں میں جا نکلا وہ بہت ہی ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آ رہا ہے کہ وہ بھی ویرانی میں اس سے مشابہ ہے یا یہ کہ اس جنگل کی ویرانی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گھر لوٹ چلیں۔"

گھر یاد آنے کے آسی صاحب نے دو سبب بیان فرمائے ہیں، اوّل یہ کہ دشت بھی ویرانی میں گھر سے مشابہ ہے اور یا یہ کہ دشت کی انتہائی ویرانی سے خوف طاری ہوتا ہے جس سے شاعر گھر لوٹ چلنے کی فکر کرتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عاشق نے دشت کا رُخ دشت سمجھ کر کیا تھا یا باغِ ارم۔ دشت نوردی پہ کمر بستگی تو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ گھر کی ویرانی بقدرِ ظرف وحشت نہ تھی اور عاشق نے سودائے صحرانوردی کی آسودگی کی خاطر گھر سے بھی زیادہ ویران مقام کی تلاش کی لیکن جب اس نے دشت کی ویرانی اپنی توقعات اور خیالات کے مطابق نہ پائی تو دشت کی غیر متوقع بے مایگی اور بے بضاعتی پر طنز و استعجاب سے کہنے لگا۔ ع۔ "کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!" یعنی اس ویرانی کا کیا شمار ہے اس سے زیادہ تو اس کا گھر ہی ویران و وحشت ناک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کسی شے کے متعلق ایک اعلیٰ تصور قائم کر لیتا ہے۔۔۔ اور پھر وہ اس قائم کردہ تصور سے کم اُترتی ہے تو اُس صفات کی جس قدر بھی چیزیں مشاہدے میں کبھی آتی ہیں سب کی سب سامنے آ جاتی ہیں اور موجودہ چیز کی غیر متوقع پستی پر حیرت ہوتی ہے۔ دوئم یہ کہ دوست کی عدم موجودگی میں گھر کا دشت سے زیادہ ویران ہونا قرین قیاس بھی ہے اور شاعر کی قوتِ متخیلہ کا کمال بھی۔

غالبؔ نے اس خیال کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مختلف مقامات پر نظم کیا ہے مثلاً

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس شعر میں سبزہ و بہار کے لفظ سے خیال گزرتا ہے کہ شاید گھر آباد ہے لیکن گھر میں سبزہ کا اُگنا انتہائے ویرانی کی دلیل ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر بھی اسی خیال کا حامل ہے۔

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

فانیؔ نے بھی اس خیال کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے:

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آسی صاحب فرماتے ہیں:-''ہم وہ آشفتہ سر تھے کہ کبھی سروپا کا ہوش نہیں رہا اور یہ حالت کچھ آج ہی نہیں بلکہ بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ انتہا یہ ہے کہ شوخی سے ہم نے مجنوں کے سر پر مارنے کو جب پتھر اُٹھایا تب اپنا سر یاد کیا۔''

مولانا نے اس شعر کی مطلب نگاری میں عجیب اختراع سے کام لیا ہے اوّل تو شعر کے کسی لفظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کی آشفتہ سری اور اپنے سروپا کی بے خبری حد سے گزر گئی ہے اور اس کی حالت نہ صرف آج ایسی ہے بلکہ بچپن میں بھی یہی رنگ تھا اور اگر بقول آسیؔ صاحب یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ آشفتہ سری کی وجہ سے شاعر کو سروپا کا ہوش نہیں ہے تو شوخی سے مجنوں پر پتھر اُٹھانا اور پتھر اُٹھاتے ہی اپنے سر کے تحفظ کا خیال آجانا کیا معنی رکھتا ہے؟۔۔۔ پتھر اُٹھاتے ہی اپنے سر کا خیال آنا اس حقیقت پر دال ہے کہ پتھر اُٹھانے والا نہ صرف انتہائی باہوش انسان ہے بلکہ دور اندیش بھی اور اس خیال سے کہ کہیں مجنوں کی طرح اس کا بھی حشر نہ ہو اپنے طفلانہ اقدام سے باز رہتا ہے۔ اس لئے آسی صاحب کی ''آشفتہ سری'' کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

شاعر کا مقصود صرف یہ ہے کہ مجھ میں بچپن ہی سے عشق کا انتہائی احساس موجود تھا اور انتہا یہ ہے کہ بچپن میں جب میں نے دوسرے بچوں کے ساتھ مجنوں پر پتھر اُٹھایا تو مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں میں بھی مجنوں کی طرح مبتلائے عشق نہ ہو جاؤں اور لڑکے اسی طرح میرے سر پر بھی سنگ زنی کریں۔ غالبؔ نے اس خیال کو دوسری جگہ بھی نظم کیا ہے:

فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آسیؔ صاحب فرماتے ہیں:-''ہم کسی کام کے ہونے نہ ہونے سے کیوں گھبرائیں۔ سات آسماں گردش میں ہیں ان کے پھرنے اور گردش کرنے کا آخر کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور جو کچھ ہونا ہوگا ضرور ہوکر رہے گا یا یہ کہ ہم جو زندگی سے گھبرا کر مرنے کے تمنائی ہیں فضول ہے۔ آسمان رات دن گردش کرتے ہیں آخر اس کی گردش سے عمر ضرور تمام ہوجائے گی۔''

آسیؔ صاحب نے مسلسل عبارت میں شعر کے دو مفہوم بیان فرمائے اوّل یہ کہ ہم کسی کام کے ہونے نہ ہونے سے کیوں گھبرائیں سات آسماں گردش میں ہیں ان کا کوئی نتیجہ ضرور ہوگا اور جو کچھ ہونا ہے وہ ضرور ہوکر رہے گا۔ یہ دراصل شعر کی نثر ہے مطلب نہیں اس نثر سے زیادہ آسان تو خود غالبؔ کا شعر ہے۔ دوسرا مطلب آسی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں:-''ہم جو زندگی سے بے زار ہوکر مرنے کی تمنا کرتے ہیں بیکار ہے آسمان کی گردش سے عمر ضرور تمام ہوجائے گی۔'' فاضل شارح نے یہ مطلب خود گڑھا ہے ورنہ شعر کے کسی لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر زندگی سے گریزاں ہے اور آلام سے چھٹکارے کی خاطر موت کا متمنی ہے اور اس مقصد برآری کی اُمید گردشِ آسماں سے لگائے ہوئے ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ''گھبرائیں کیا'' کے ٹکڑے سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر حوادثِ زمانہ سے خائف نہیں ہے بلکہ اسے انقلاب یا گردشِ ہفت چرخ سے امید افزا توقعات ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ انقلابات کا طوفان شاعر کی فنا کا باعث ہی ہوسکتا ہے کہ انقلابات اور گردشِ آسمانی کے اثرات شاعر کے موافق ہوں اور اس طرح اس کی بے اطمینانی سکون میں اور ناامیدی امید میں بدل جائے۔ حوصلہ مند شخصیتیں انقلاب کو ایک پائیدار حقیقت سمجھ کر خوش آمدید ہی کہتی ہیں اور اُسے زندگی کے ارتقاء کا جادۂ خاص سمجھتی ہیں۔ ہر انقلاب میں ایک تازہ زندگی کی توقع رکھتی ہیں اور قبل از مرگ خوف و ہراس سے کبھی واویلا نہیں مچاتیں بلکہ رجائی (Optimistic) نظریہ کی مدد سے زندگی کے آخری لمحوں میں بھی تبسم زیرلب قائم رہتا ہے۔ غالبؔ نے اسی خاکہ کو بیان کیا ہے۔ ذیل کا یہ شعر بھی اسی مفہوم کا ہے۔

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

آسیؔ صاحب نے آخر میں اپنے مفہوم کی تائید میں ذیل کے یہ اشعار بھی پیش فرمائے ہیں:

ہفت اختر و نُہ چرخ خود آخر بہ چہ کارند
برقتلِ من ایں عربدہ با یار روا نیست

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

حیرت ہے کہ آسی صاحب جیسے صاحبِ فکروفہم نے ان اشعار کو غالبؔ کے شعر کے ہم معنی بتایا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

آسیؔ صاحب لکھتے ہیں:-"وہ لوگوں سے میری بینوائی اور عشق وغیرہ کا تذکرہ سن کر پوچھتے ہیں کہ غالبؔ کون ہے اب ہمیں کوئی یہ بتائے کہ بتائیں کیا کہ غالب کون ہے۔ نعمت علی خاں عالیؔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

زمردم یاری پرسد کہ عالیؔ کیست طالع بیں
کہ عمرم درمحبت رفت وکار آخر رسید ایں جا

مگر غالبؔ کے مصرعۂ ثانی کا جواب نہیں ہے۔"

اس شعر کی بھی آسیؔ صاحب نے نثر کردی ہے وہ بھی صداقت سے دور ہے۔ آسی صاحب کا خیال ہے کہ معشوق خود عاشق سے نہیں بلکہ دوسروں سے پوچھتا ہے کہ غالبؔ کون ہے اور جب اس کی خبر غالبؔ کو ہوتی ہے تو غالبؔ معشوق کی بے نیازی وتغافل پر حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہیں لیکن شعر میں سوال کرنے والا (وہ) معشوق ہے اور جواب دینے والا بلا شرکت غیرے عاشق خود ہے۔ ضمیر متکلم واحد کی جگہ اکثر لوگ جمع کا صیغہ بولتے ہیں۔ غالبؔ نے بھی یہی کیا ہے اور "میں بتلاؤں کیا" کی جگہ ضرورتِ شعری سے "ہم بتلائیں کیا" لکھا اور اس سے یہ کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کہ اس شعر میں عالیؔ کے شعر کی طرح معشوق غیروں سے غالبؔ کا حال پوچھتا ہے اور غالبؔ اس تغافل پر انگشت بدنداں ہیں۔ عالیؔ کا شعر غالبؔ کے شعر سے بہت پست ہے۔ غالب کا شعر داخلی محاکات کا اعلیٰ نمونہ ہے اور چند آسان لفظوں میں جس طرح ایک داستان حسن و عشق نظم کردی گئی ہے وہ غالبؔ کی قوتِ تخیل اور قادرالکلامی کا کمال ہے۔ شعر کا مطلب صرف یہ ہے کہ غالب کی محبت اور اس کے معشوق کی رسوائی وبدنامی کا چرچا عام ہے۔ معشوق نے صرف اپنے عاشق کا نام سُن رکھا ہے اور اس سے شناسائی نہیں ہے اور اگر شناسائی بھی ہے تو تجاہل عارفانہ سے لوگوں سے پوچھتا رہتا ہے کہ غالب صاحب کون ہیں جو میری بدنامی اور رسوائی کا

سبب بنے ہوئے ہیں۔ ایک دن بالکل غیر سمجھ کر یا انجان بن کر معشوق خود غالبؔ ہی سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ غالبؔ صاحب کون ہیں جو مجھ پر جان دیتے ہیں اور اس طرح خود کو اور مجھے بھی بدنام کرر ہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر کوئی جواب نہ بن سکا ہوگا کیونکہ بقول عرفیؔ

میاں حسن و محبت بیگانگیست چناں
کہ درمیانِ ازاں جُز حیا نمی گنجد

اور معشوق کے روبرو باوجود انتہائی بیباک اور حاضر جواب ہونے کے دماغ کا مختل ہو جانا، جواب دہی کی طاقت شل ہو جانا اور غیرتِ عشق ورعب حُسن و جمال سے زبان نہ کھلنا عشق کے حقیقی لوازم ہیں جن کا تعلق نفسیات سے ہے۔ اُردو شاعری میں اس مفہوم کے متعدد شعر موجود ہیں۔ مومنؔ کا ایک شعر بالکل اسی مفہوم کا ہے اور غالبؔ کے شعر سے بلند بھی، لکھتے ہیں:

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں
مجھ کو فکرِ جواب نے مارا

میرؔ لکھتے ہیں:

کہتے تھے اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے لیک
وہ آ گئے تو سامنے اُس کے نہ آئی بات

مصحفیؔ کہتے ہیں:

دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں
مل گیا وہ تو نہ اک حرف زباں سے نکلا

جراُتؔ فرماتے ہیں:

بصد آرزو جو وہ آیا تو یہ حجابِ عشق سے حال تھا
کہ ہزار دِل میں تھیں حسرتیں اور اُٹھانا آنکھ محال تھا

فانیؔ کہتے ہیں:

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہئے
تو چپ ہیں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زباں کوئی

خود غالبؔ نے بھی اسی خیال کو اس طرح نظم کیا ہے:

آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آسؔی صاحب فرماتے ہیں:۔''موت تو یوں نہیں آتی کہ اس کا ایک وقت مقرر ہے اور اپنے وقت معینہ پر آئے گی مگر نیند کو آنے میں کیا عذر ہے وہ رات بھر کیوں نہیں آتی یا یہ کہ موت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی آخر نینداس کی فکر میں کیوں نہیں آتی۔''

آسی صاحب نے نیند نہ آنے اور موت نہ آنے کے الگ الگ منطقی تجزیے کئے ہیں اور ان میں کسی قسم کے ربط کا اظہار نہیں ہے گویا عاشق شدتِ غم و آلام سے موت اور نیند دونوں کا طالب تھا جب دونوں میں سے ایک بھی نہ آ سکی تو حیرت سے کہتا ہے موت تو اپنے معینہ پر آئے گی آخر نیند کیوں نہیں آتی لیکن جب کشمکش زندگی کا یہ عالم ہے کہ موت کو نہ صرف زندگی پر ترجیح دی جارہی ہے بلکہ آلام سے نجات کی خاطر موت کی دعا مانگی جارہی ہے تو پھر رات بھر نیند نہ آنے پر حیرت واستعجاب کیسا؟ پریشانی میں نیند تو حرام ہو ہی جاتی ہے اس طرح آسؔی صاحب کے بیان کئے ہوئے معنی بے معنی ہو جاتے ہیں، آخر میں آسؔی صاحب نے تشکک کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ موت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی، نینداس کی فکر میں کیوں نہیں آتی۔''

اس جگہ بھی مولانا نے صرف شعر کا نثر کر دی ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر کبھی کشمکشِ حیات میں موت کا خوف انسان کے دل میں پیدا ہوا تو نیند اُڑ جاتی ہے لیکن ایک حوصلہ منداور بلند کردار انسان اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر موت تو برحق ہے وہ اپنے وقت پر آ کر رہے گی اس کا خطرہ ہر وقت محسوس کرنا بیکار ہے۔موت کے خوف کو دل سے نکال دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جب نیند نہیں آتی تو اسے اپنی پریشانی وخلش کا راز سمجھ میں نہیں آتا اور حیرت سے کہتا ہے کہ صرف موت ایسی چیز ہے جس کے خوف سے نیند اُڑ جاتی ہے۔مجھ پہ موت کا خوف طاری نہیں

اس لئے کہ میں جانتا ہوں:

''موت کا ایک دن معین ہے، آخر پھر نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔'' دوسرے مصرعہ میں سوزِ محبت و تپشِ عشق کی جس سچی کیفیت کو اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے مذاقِ سلیم ہی کیف وحظ اُٹھا سکتا ہے اور جس رمز و تجاہل عارفانہ سے ''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی'' کا استعجابی استفسار قائم کیا گیا ہے اس کی مثالیں اُردو شاعری میں کم ملیں گی۔

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آسیؔ صاحب لکھتے ہیں:-''میں تلاشِ منزلِ مقصود میں سرگرداں اور دیوانہ ہو رہا ہوں اور انتہاد دیوانگی کی یہ ہے کہ اپنے راہبر کو بھی نہیں پہچانتا کہ کون مجھ کو اپنی منزل تک پہونچا دے گا۔ اس دیوانگی میں جس راہبر کو تیز جاتا دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے اور اُسے بھی میری طرح جلد پہونچنے کے لئے اضطراب ہے بس اس خیال کی بنا پر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ جب دیکھتا ہوں کہ وہ بھی دوسری جگہ جا رہا ہے اور اس کی منزل اور ہے تو پلٹ آتا ہوں کوئی اور تیز رو ملتا ہے پھر اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ یہ شعر گویا تصویر دیوانگی ہے اور محاکات شاعری اسی کا نام ہے۔'' آسی صاحب نے تھوڑی دیر ہر ایک کے ساتھ چلنے اور راہبر کو نہ پہچاننے کی وجہ دیوانگی قرار دے کر شعر کو تصویر دیوانگی کہہ دیا ہے حالانکہ شعر کے کسی لفظ سے بھی ذہن دیوانگی کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ غالبؔ تو صرف ایک عالمگیر کلیہ کی نفسیاتی تحلیل کر رہا ہے اور شعر میں اس محاکاتِ داخلی کا رنگ چڑھا رہا ہے جو واقعات پر قائم ہے۔ قاعدۂ عالم یہ ہے کہ جب کسی علم وفن کا مبتدی اس علم وفن کے تمام رموز و نکات سے بہرہ ور نہیں ہوتا تو وہ ہر اس شخص کا معتقد و مداح ہو جاتا ہے جو اس سے زیادہ دست گاہ و آگاہی رکھتا ہے۔ لیکن جب اس شخص سے بھی زیادہ ہنرمند آدمی نظر آ جاتا ہے تو پہلے آدمی کی وقعت خود بخود اس کی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے کی تقلید و تائید میں لگ جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قایم رہتا ہے جب تک وہ خود اس علم وفن کے تمام مدارج

طے کر کے کمال کو نہیں پہونچ جاتا یا اس میں راہبر کے انتخاب کی پوری صلاحیت نہیں پیدا ہو جاتی۔ اسی کلیہ کو غالبؔ نے بیان کیا ہے اور تھوڑی دیر راہبر کے ساتھ چلنے یا راہبر کو نہ پہچاننے کی وجہ خود مقلد کی ناتجربہ کاری اور کوتاہ علمی ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے مولانا حالیؔ نے بھی عشق حقیقی کی رنگ میں اس شعر کا مطلب اسی انداز میں بیان فرمایا ہے اور انھوں نے دیوانگی کا تذکرہ کہیں نہیں کیا۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

آسی صاحب لکھتے ہیں:-''اے ندیم خیر تجھ سے تو کچھ نہیں کہتے مگر اتنا کہ اگر کہیں نامہ بر ملے تو ذرا ہمارا سلام کہنا کہ واہ خوب ہمارے خط کا جواب لائے۔'' ظاہر ہے کہ یہ شعر کا مطلب نہیں ہے صرف نثر ہے دوسرے یہ کہ ''سلام کہیو'' میں طنز کا پہلو ہے لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں پیدا ہوتا کہ ''خوب ہمارے خط کا جواب لائے'' قاصد جواب لانے کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ مکتوب الیہ کو کوئی جواب نہ دے اور وہ خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس کا کام خطوط سپردہ کو لانا اور لے جانا ہے وہ کسی کو جواب دینے یا نہ دینے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ لہذا آسی صاحب کا فرمودہ مطلب صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ڈاکٹر بجنوری، نظم طباطبائی اور حسرت کی شرحیں آسی صاحب کے سامنے تھیں پھر بھی خدا جانے کیوں صحیح اور قرین قیاس مضمون سے گریز کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں مرزا غالب نے خود بھی اپنے ایک خط میں اس شعر کا مفہوم یوں بیان فرمایا ہے:-''شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ کہیں قاصد معشوق پر عاشق نہ ہو جائے۔ ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد الیہ ہے ضامن ہوں کہ ایسی حرکت نہ کرے گا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔۔۔۔ عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے۔ کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر ہے۔ اے ندیم تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر ملے تو اس سے میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا۔'' خود صاحب شعر کی وضاحت کی موجودگی میں آسی صاحب کی

ذاتی مطلب نگاری عجیب و غریب ہے۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

آسی صاحب لکھتے ہیں:۔''جب تک قاصد واپس آئے میں ایک خط اور لکھ رکھوں کیونکہ وہ جو کچھ لکھیں گے مجھے معلوم ہے۔۔۔جو وہ لکھیں گے جواب میں، میں نے بہت سے معانی پیدا کر دیے ہیں جس سے اتنے پہلو نکلتے ہیں۔انکار وصل جوان کی عادت ہے اس مرتبہ بھی لکھیں گے۔'' آسی صاحب کا بیان کردہ مفہوم کسی حد تک درست ہے لیکن میرے نزدیک ''میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں'' کا دعویٰ محض قیاسی نہیں ہے بلکہ عاشق کو معشوق کے دل کی حالت فی الواقع معلوم ہے اور ان دونوں کو بہ فیض عشق ایک دوسرے کے دل کی خبر اسی طرح رہتی ہے جیسے خود اپنے دل کی اور اسی لئے عاشق پہلے خط کے جواب کا انتظار نہ کر کے اور آنے والے جواب کو خود تک پہونچنے سے پہلے ہی دوسرا خط لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔اس مفہوم کی تائید غالبؔ کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نگار، جولائی ۱۹۵۴ء

نقش ہائے رنگ رنگ

مذکورہ بالا عنوان کے تحت، شاہ حسن عطا صاحب کا مضمون اگست کے ''کتابی دُنیا'' میں شائع ہوا ہے موصوف نے غالب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے اس شعر کو

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست

عالم و عامی، دونوں نے بار بار پڑھا اور سنا سنایا ہے اور میری ناچیز رائے میں صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ عام طور پر لوگ شعر کو غالبؔ کے فارسی اور اردو کلام کے موازنہ کے موقع پر پڑھتے ہیں اور ان کا طرز استدلال یہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کا فارسی کلام تو عبقریت اور شعر گوئی کے کمال پر دال ہے مگر ان کا اردو کلام معمولی درجہ کا ہے۔''

اس عبارت کے آخری حصے کو دراصل یوں ہونا چاہیے تھا کہ غالبؔ کے نزدیک ان کا فارسی کلام تو ان کی ذہانت، عبقریت اور شعر گوئی کے کمال پر دال ہے، مگر ان کا اردو کلام معمولی..... اس لئے کہ لوگ غالبؔ کے اس شعر کو استدلال کے طور پر نہیں بلکہ غالبؔ کے دعوے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور شعر کا اصل مفہوم ہے کہ غالب اپنے فارسی کلام کو اردو سے بہتر سمجھتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے علاوہ اس شعر کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔ شاہ حسن عطا صاحب نے سر عبد القادر اور دوسرے علماء و ادباء کی شعر فہمی پر اس سلسلے میں بے جا طنز کیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے واضح طور پر فارسی کو اردو پر ترجیح دی ہے اور کھینچ تان کر بھی کوئی شخص اس کا مفہوم نہیں بدل سکتا۔ اس لئے حسن عطا صاحب کا یہ اعلان کہ

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

عجیب سی بات ہے۔

حسن عطا صاحب نے اس سلسلہ میں ''بے رنگ'' کے لغوی معنی پر بھی بحث کی ہے اور اپنی دانست میں نئے معنی ڈھونڈ نکالے ہیں چنانچہ وہ Dictionary of Persian Language کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

''بے رنگ'' کا مطلب خاکہ یا نقشہ ہے اور انگریزی میں اس کے مقابل Sketch کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔''

یہ کوئی ایسے معنی نہیں جو فارسی کے دوسرے لغات سے الگ ہوں۔ غیاث اللغات، سراج اللغات اور بہارِ عجم میں یہی معنی دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن اسے اصلاً ایک لفظ یعنی مفرد خیال کرنا غلطی ہوگی۔ یہ ''بے'' اور ''رنگ'' سے مرکب ہے اور ایسے خاکے کو کہیں گے جس میں رنگ نہ بھرا گیا ہو۔ خاکہ یا Sketch بھی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رنگ آمیز نہیں سادہ ہو بہارِ عجم میں بے رنگ کے معنوں میں لکھا ہے ''نمونہ کہ پیش از بنائے عمارت کشند و بمعنی نقشہ تصویر کہ ہنوز دراں رنگ آمیزی نہ کردہ باش،'' ''بے رنگ'' کے ان لغوی معنی کو ذہن رکھ کر غور کیجئے تو فارسی کلام کو ''رنگ رنگ'' اور اردو کلام کو ''بے رنگ'' کہنے کا اس کے سوا کیا مفہوم ہوسکتا ہے۔ غالب اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے بہتر خیال کرتے تھے۔ غالباً حسن عطا صاحب کو اس شعر کے معنی میں مغالطہ اس لئے ہوا کہ انھوں نے پہلے مصرع میں لفظ بیں اور دوسرے میں ''بگذر'' نظر انداز کر دیا ہے۔ ورنہ یہ دونوں لفظ اردو اور فارسی کلام کے موازنہ کو اتنا واضح کر دیتے ہیں کہ اس مغالطے کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہتی۔ شاہ صاحب ''بے رنگ'' کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں:

''گویا اس شعر کا یہ مطلب ہوا ''میرا اردو کلام میری شاعری کا محض ایک خاکہ ہے ایک نقشہ ہے جسے میں نے مرتب کیا ہے اور میری فارسی شاعری دیکھنے سے البتہ ان رنگارنگ نقوش کا صحیح شعور پیدا ہوگا جو میں نے اس خاکے میں بھرے ہیں۔ اس شعر سے غالب کے اس تفاخر کا تو اظہار الگ ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی فارسی شاعری پر اُٹھتے بیٹھتے کیا ہے مگر یہ شعر ان کے اردو کلام کی تنقیص و تقبیح ہرگز نہیں''

یہاں ''تنقیص و تقبیح'' کے الفاظ زائد ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرنے اور فارسی کے متعلق ''ببیں'' اور اردو کے بارے ''بگذر'' کا حکم لگانے کا منطقی نتیجہ کیا اس کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے کہ غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کلام سے گھٹیا خیال کرتے تھے۔

شاہ حسن عطا صاحب نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ غالب فارسی میں اہلِ زبان کے مقلد تھے اس لئے وہ یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فارسی کلام اردو سے بہتر ہے یہ ایک الگ بحث ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ غالب نہایت سنجیدگی سے اپنی اُردو نظم ونثر کو فارسی نثر ونظم سے کم تر سمجھتے تھے۔ ایک جگہ نہیں ہزار جگہ نہایت واضح طور پر انھوں نے اس کا اعلان کیا ہے۔ اب آپ اسے ان کا احساس کمتری کہیے یا احساس برتری، نسلی تعصبات کا نتیجہ سمجھئے یا غلامانہ ماحول کا اثر خیال کیجئے، لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انھوں نے فارسی ہی کو اپنے لئے معیارِ سخن قرار دیا اور اردو کو فارسی کے مقابلے میں آخری دم تک کم مایہ خیال کرتے تھے۔ ان کے فارسی کلام میں ایک دو نہیں سینکڑوں اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں انھوں نے اپنی فارسی دانی وفارسی گوئی پر فخر و ناز کا اظہار کیا ہے۔

اوپر جو شعر زیر بحث آیا ہے اس میں تو واضح طور پر اردو سے فارسی کو کم تر درجہ دیا گیا ہے۔ جس فارسی قطعہ کے یہ اشعار ہیں اگر حسن عطا صاحب پڑھ لیتے تو مغالطے کا شکار نہ ہوتے۔ اس شعر سے پہلے کے چند اشعار دیکھئے:

اے کہ در بزم شہنشاہِ سخن رس گفتہ ای
کہ بہ پرگوئی فلاں در شعر ہمسنگِ منست
راست گفتی لیک میدانی کہ بنود جائے طعن
کم تر از بانگِ دہل، گر نغمۂ چنگ منست
نیست نقصان یک دو جزوست از سواد ریختہ
کاں وژم برگے ز نخلستانِ فرہنگ منست
فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ منست

بعد کے اشعار کا بھی یہی انداز ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی کو اردو پر بالا علان ترجیح دے رہے ہیں۔ دو تین شعر دیکھئے:

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگِ منست

کہ درخشد جوہر آئینہ تاباقیست زنگ
صیقلے آئینہ ام ایں جوہر آں زنگِ منست
راست می گویم من واز راست سرنتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگِ منست

انھیں اشعار پر منحصر نہیں، اکثر جگہ انھوں نے خود کو غیر معمولی فارسی داں اور فارسی گو کہا ہے۔ نظم ہی نہیں نثر میں بھی اس قسم کے بیانات یا دعوے ملتے ہیں۔ نواب صاحب باندہ کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

''عرصہ سے ریختہ نہیں کہتا صرف فارسی میں غزل سرائی کرتا ہوں لیکن ظل اللہ کا منشا یہ ہے اس لئے کبھی کبھی کہہ لیتا ہوں۔''

جب اسٹورٹ ریڈ صاحب نے اردو قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تو منشی شیو نرائن کو مختلف خطوط میں لکھا:

''اردو میں اپنا کمال کیسے ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کہاں ہے؟ میں اردو میں کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ سے اُردو کی فرمائش ہو۔''

''بھائی تم غور کرو، اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا۔''

کیا یہاں فارسی کے مقابلے میں غالبؔ نے اردو کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ضرور دیکھا۔

فارسی نثر اور اردو نثر کے باب میں بھی وہ یہی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ آخری بیس سال کے سوا عمر بھر خطوط فارسی میں لکھتے رہے اور نثر کے متعلق ان کا یہ دعویٰ:

''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

بہت بعد کا ہے ورنہ ابتداً جب ان سے منشی شیو نرائن نے ان خطوں کو شائع کرنے کی اجازت چاہی تو جواب میں لکھا:

''اس کی شہرت میری سخن وری کے منافی ہے۔ اس کا چھاپنا میرے خلافِ طبع ہے۔''

کیا ان تصریحات کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ، اردو نظم و نثر کو، فارسی نظم و نثر کے مقابلے میں حقیر یا کم تر خیال نہیں کرتے تھے؟

شاہ حسن عطا صاحب اہلِ نظر میں سے ہیں۔ غالب کی پوری زندگی اور کلام ان کے سامنے ہے اور انھیں خبر ہے کہ تیس برس کی عمر کے بعد سے غالب کی زیادہ توجہ فارسی ہی کی طرف رہی۔ وہ عموماً کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت اردو کی طرف رجوع ہوتے تھے کیوں! صرف اس لئے کہ انھیں فارسی دانی کا غرّہ تھا اور اردو ان کے نزدیک کم مایہ تھی۔

حسن عطا صاحب نے اردو میں خط لکھنے کے سلسلے میں غالبؔ کے جس خط کا حوالہ دیا ہے وہ بھی مغالطہ آمیز ہے۔ یہ خط ان کی اُس عمر کا ہے جبکہ وہ مجبوراً اردو میں خط لکھتے تھے۔ افسوس کہ شاہ صاحب نے سیاق وسباق کو محذوف کر کے اپنے کام کی سطریں اس میں نقل کری ہیں ورنہ اگر وہ یہ سطریں بھی:

"بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژدہی وجگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔
حرارتِ عزیزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں"

اس خط سے نقل کر دیتے تو بات صاف ہو جاتی اور شاہ حسن عطا صاحب اس نتیجہ پر ہرگز نہ پہنچتے کہ اس خط میں غالب اردو کو فارسی پر ترجیح دے رہے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ غالبؔ نے اپنی فارسی دانی یا فارسی نظم ونثر کو اردو نظم ونثر پر ترجیح کے جو دعوے کئے ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔ سو یہ الگ بحث ہے اور اس سلسلے میں بھی دو رائیں نہیں ہیں۔ سب کو ان کے دعوؤں پر بارہ سنگھا کی کہانی یاد آتی ہے کہ غالبؔ جس چیز کو حقیر اور اپنی شہرت یا مرتبے کے منافی سمجھتے تھے وہی ان کی عظمت وشہرت کا اصل سبب بن گئی اور فارسی نظم و نثر پیچھے رہ گئی۔

ع انقلابات ہیں زمانے کے

نگارِ پاکستان، مارچ ۱۹۵۴ء

غالب کی اُردو رُباعیاں اور اُن کی تاریخی وتنقیدی اہمیت

غالبؔ کی غزل اور مثنویات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اردو رُباعیات بہت کم زیرِ بحث آئی ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غالب کے اردو دیوان میں، رباعیوں کی تعداد دوسرے بڑے شعرا خصوصاً غالب کے معاصرین کے مقابلے میں بہت کم ہے یعنی صرف سولہ۔ پھر بھی ان سولہ میں سے مندرجہ ذیل تین رباعیاں غالب کے ارتقائے فکروفن کے سلسلے میں اکثر زیرِ بحث آئی ہیں اوران سے غالب کے بعض اہم فنی وتاریخی مقدمات کے حل میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(۱)

بعد از اِتمام بزمِ عید اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم
اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

(۲)

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ

واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

(۳)

مُشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

پہلی رُباعی نے بیاضِ غالب بخطِ غالب (نسخۂ امروہہ) مطبوعہ نقوش، لاہور ۱۹۶۹ء اور ''دیوانِ غالب بخطِ غالب'' نسخۂ عرشی زادہ، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء کے بارے میں یہ راز فاش کیا کہ یہ جعلی ہیں۔ ہر چند کہ خطی نسخہ ایک ہی تھا اور اسے بوجوہ طباعت کے وقت دونوں نام دیے گئے اور اس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ بخطِ غالب ہے اور ۱۲۳۱ھ کا مکتوبہ ہے جب کہ غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ صرف ۱۹ سال تھی۔ اس نسخے کے جعلی ہونے کے سلسلے میں مجھ سمیت بہت سے اہلِ نظر نے شواہد دیے لیکن یہ بات بہت دنوں تک تسلیم نہیں کی گئی آخر کار کمال احمد صدیقی نے بہ کمالِ محنت اس کے جعلی ہونے کے بارے میں تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب لکھی۔ یہ کتاب ''بیاضِ غالبؔ'' تحقیقی جائزہ کے زیرِ عنوان ''ادارۂ مطالعاتِ غالبؔ'' سری نگر، کشمیر سے، مذکورہ بالا خطی نسخوں کی اشاعت کے فوراً بعد مجلد شائع ہوئی۔ پہلی بار صرف ایک سو کی تعداد میں چھپی تھی قیمت پانچ سو روپے تھی، اس کا ایک نسخہ راقم الحروف کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

غالب کے مذکورہ بالا خطی نسخے میں غالب کی وہ رباعی موجود ہے جس کا ذکر اوپر آیا لیکن اس رُباعی کے مطالب و الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہ ۱۹ سال کی عمر کی نہیں بلکہ اُس وقت کی تخلیق ہے جب کہ غالب طفلی و جوانی کی منزلوں سے بہت آگے بڑھ کر ''سوادِ اقلیم عدم'' یعنی پیرانہ سالی کی آخری حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

دوسری رُباعی نے تنقید خصوصاً عروضی تنقید کی ایک طویل بحث کو جنم دیا یہ بحث ماہنامہ نگار (لکھنؤ) کے صفحات میں بھی زیرِ بحث آئی ہے اور اس میں علامہ نیاز فتح پوری سمیت، بہتوں نے حصہ لیا ہے۔ غالباً سب سے پہلے اس پر نظم طباطبائی نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس کا دوسرا مصرعہ:

دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب

رُباعی کے وزن سے خارج ہے اور اس میں ایک ''رُک'' بروزن فع زائد ہے۔ بعض نے اسے کتابت کی غلطی بتایا اور مصرعے کی صحت یوں کر دی کہ:

''دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ''

لیکن اس طرح مصرعہ مہمل ہو جاتا ہے، ''رُک کر بند ہو گیا'' ہے اور ''رُک رُک کر بند ہو گیا ہے'' معنوی اعتبار سے دونوں الگ الگ باتیں ہیں اور ایک ''رُک'' کے خارج کرنے سے شعر کا مفہوم لایعنی ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں دیوانِ غالب کے سارے قدیم و جدید نسخوں میں ''رُک رُک کر'' درج ہے حتیٰ کہ ایسے نسخوں میں بھی جو غالب کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں۔ اس لیے اسے کتابت کی غلطی کہنا درست نہ ہوگا، غالب سے چوک ہو گئی ہے اور انھوں نے رباعی کے دوسرے مصرعے کو وزن سے خارج ہی نظم کیا ہے۔ بایں ہمہ اس سے غالب کے شاعرانہ مرتبے یا اُن کی عروض دانی پر حرف نہیں آتا۔ رباعی کا وزن ایک مشکل وزن ہے اور اس کو برتنے میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگاتے ہیں، غالب سے بھی ایک جگہ نادانستہ لغزش ہو گئی۔ تیسری رباعی کی بھی ایک الگ داستان ہے، اس کا چوتھا مصرعہ:

''گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل''

جسے فارسی ضرب المثل کہنا چاہیے۔ غالب کے ہم عصر شاعروں کے اُن تنقیدی و تنقیصی روّیوں کو سمیٹے ہوئے ہے جو غالب کی شاعری کو مہمل کہہ کر سرِ محفل اُن کا مذاق اُڑاتے تھے۔ غالب نے اس طرح کے معترضین کو اپنے اشعار کے ذریعے اور مقامات پر بھی جوابات دیئے ہیں۔ مثلاً اُن کے یہ اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ مری بات سمجھنا محال ہے

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بک رہا ہوں جنوں میں، کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

لیکن زیرِنظر رباعی کا ایک خاص پس منظر ہے، حکیم آغا جان عیش دہلی کے نامور شاعر تھے اور غالب و مومن کے ہم عصروں میں تھے، اور غالب کی مشکل پسندی اُنھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی' چنانچہ ایک دن بھری محفل میں اُنھوں نے غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا یہ قطعہ سُنایا جو آبِ حیات میں نقل ہوا ہے:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب یہ اشعار سُن کر تلملا گئے ہوں گے چنانچہ اُنھوں نے اُن کے جواب میں یہ رباعی کہی کہ:

مُشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کر اِسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

لیکن رباعی کے یہ مصرعے ابتداً اس طور نہ تھے بلکہ غالب نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا تھا اور اس کی صورت یوں تھی کہ:

مُشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سُن کر جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

بعد کو غالب نے اس کا دوسرا مصرعہ قریبی دوستوں کے کہنے سے بدل دیا تا کہ رباعی ثقہ محفل میں سنانے کے لائق رہے اور کسی کی دل آزاری کا وسیلہ نہ بنے۔

مختصراً یہ کہ غالب کی اردو رباعیات کی تعداد بہت کم ہے بایں ہمہ غالب کے سوانح اور تحقیق وتنقید میں اُن کا بار بار ذکر آیا ہے اور یہ ذکر ثابت کرتا ہے کہ غالب کی رباعیاں تعداد میں کم ہیں لیکن معیارِ شعر اور معیار نقد وتحقیق غالب کے باب میں اُن کی خاص اہمیت ہے۔

وقار عظیم

''غالب: شاعر امروز وفردا''

غالب کی سویں برسی گزر چکی لیکن اس کی آمد آمد کے ساتھ علم وادب کی دنیا میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی، اس کا زور اب تک نہیں تھما۔ تحقیق وتنقید نے اس عظیم انسان اور عظیم شاعر کی عظمت کے اعتراف کے جو منصوبے بنائے تھے، ان کی تکمیل کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد غالب پر کوئی نہ کوئی تحقیقی، تنقیدی یا ملی جلی تحقیقی وتنقیدی کتاب شائع ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ تحقیق وتنقید کا یہ صدقہ جاریہ یوں ہی جاری رہے گا اور خدا کرے کہ جاری رہے کہ غالب کے فکروفن کی تازگی اور ہمیشگی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اس صدقہ جاریہ کی تازہ ترین صورت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضامین کا مجموعہ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ہے۔ اس مجموعے میں پندرہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں غالب کی شخصیت اور شاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھا، جانچا اور پرکھا گیا ہے اور فن اور فن کار دونوں کی ایسی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس کے خدوخال موزوں اور متناسب ہوں اور رنگ وآہنگ دل آویز اور جاذبِ نظر۔ یہ منصب جس سلیقے اور انداز سے ادا کیا گیا ہے، اس میں ہر جگہ تازگی وشگفتگی ہے اور پڑھنے والا ہر مضمون پڑھ کر یہ محسوس کرنے پر مجبور ہے کہ غالب کے کلام کا مرتبہ ومقام یہ ہے کہ اس میں اب بھی تاویل وتوجیہہ کے نئے نئے رُخ نکل سکتے ہیں۔ بشرطیکہ غالب کے ساتھ محقق، مبصر اور نقاد کا ذہنی اور جذباتی تعلق، زندگی بھر کی رفاقت، دمسازی، خلوص اور یگانگت کا نتیجہ ہو۔ یہ سب مضامین بقول مصنف، غالب کی ہشت پہلو ذات، جامع الصفات شخصیت، صدرنگ فن اور ہزار شیوہ ادبیت کی وکالت اور وضاحت کی غرض سے لکھے گئے ہیں اور تحقیق نے منطق کی خوش استدلالی اور تنقید نے فلسفے کی خوش فکری کی مدد سے محقق اور نقاد کی راہ کو آسان بنایا ہے۔

غالب کے اولین تعارف نگار، غالب اور غالب تخلص کے اُردو شعرا، غالب کے حالات میں پہلا مضمون، غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز، اپنی نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی اور، غالب اور اقبال، غالب نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں اور غالب، شاعر امروز و فردا، نیم تحقیقی نیم تنقیدی یا ملے جلے تحقیقی و تنقیدی مضمون ہیں۔ ان مضامین کی بنیادی خصوصیت، میں نے منطق خوش استدلالی کو بتایا ہے اور منطق میں خوش استدلالی کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ آپ کی طرح میں بھی سیاست دانوں، وکیلوں، واعظوں اور مناظروں کے ہاتھوں منطق کی روایتی زبوں حالی کے افسانے سن چکا ہوں۔ سوطرزِ استدلال نے زندگی کے ہر دور میں منطق کو اُلجھاوے ڈالنے اور مغالطے پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ منطقی مغالطوں کی جامہ دری سے محققوں کے دامن بھی محفوظ نہیں، اس لیے تنگ نظری اور سبک سری کو نیند ہی ان مغالطوں کی چھاؤں میں آتی ہے۔ لہٰذا منطق، خوش استدلال نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور دیانت دارانہ تحقیق کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات، ان سب مضامین میں بدرجۂ اتم موجود ہے جن کے نام، میں نے ابھی لیے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں۔ اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف، سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ قائم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب، کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔ مقدمات، مفرد، ملتف اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقراء، استنباط اور استنتاج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی، یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔ فرمان صاحب کے تحقیقی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی ہیں جنھیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔ منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے ابھی ان تحقیقی مضامین کے سلسلے میں کیا، ان میں بڑی سبک رفتاری سے اُبھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے جو شوق اور تجسس کو اُبھارتی، ذہن کو شک و یقین کے زیر و بم سے گزارتی ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو ہر پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول ہو۔ منطقی استدلال کا ایک اور وصف جو اِن سارے مضامین میں جاری و ساری ہے، اس کے لہجے کی ایسی متانت اور بُردباری ہے جس نے شگفتہ روی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے۔ اس تحقیق نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز

وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔

مجموعے کے تنقیدی مضامین میں بدیہی طور پر تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کا وصف اس سے بھی زیادہ ہے جتنا تحقیقی مضامین میں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تحقیقی مضامین جس طرز استدلال کا مطالبہ کرتے ہیں، اس میں ذہنی عمل کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہوئے تنقیدی مضامین میں تبصرے اور تحسین کے مرحلے، دل کی راہ سے طے ہوتے ہیں اور یہی فرق، تازگی، شگفتگی اور خوش بیانی کے مدارج میں فرق پیدا کرتا ہے۔

غالب کے کلام سے اپنی ذاتی اور شخصی رشتے کا ذکر کرتے ہوئے فرمان صاحب نے بڑی صفائی سے اعتراف کیا کہ وہ غالب کی:

"نبوت شعری پر ایمان رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے پر
اسے اپنا رہنما اور مشکل کشا سمجھتے رہے ہیں۔"

شاعر اور اس کے قاری کے باہم تعلق اور رشتے کی نوعیت اس حد تک جذباتی ہو کہ وہ اس کا پرستار بن جائے تو تعریف و توصیف میں اسے غلو اور اغراق کی حدوں سے گزر جانے کا حق بھی پہنچتا ہے۔ کسی کو اس سے، اس کا یہ حق چھیننے کا اختیار نہیں۔ یہ اس کے دل کا معاملہ ہے اور دل کی شریعت اس خاص معاملے میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ چون و چرا کے عالمگیر ضابطے یہاں استعمال نہیں کیے جاتے۔ یہ سب کچھ درست، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل کے معاملے والی بات، ہوتی بڑی ظالم ہے۔ اسے چھپا رکھیے تو دل ناسور بن جاتا ہے اور اسی لیے آدمی پر قانون قدرت کا جبر ہے کہ وہ دل کی بات کو باہر نکالے اور ساری دنیا کو اپنے درد کا ساتھی بنائے، یوں کہ دنیا اس کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے اور احساس میں مَن و تو کا فرق اور امتیاز باقی نہ رہے۔ جھگڑا یہیں سے شروع ہوتا ہے اور کیوں اور کیسے کے تیروں کی بوچھاڑ سے کلیجہ چھلنی ہونے لگتا ہے۔ دل کے باہر کی دنیا، تعریف و توصیف کے اسباب جاننا چاہتی ہے اور اپنے درد کو دنیا کا درد بتانے کی آرزو رکھنے والا انسان اپنی ذات سے باہر نکل کر وکالت شروع کرتا ہے۔

اس وکالت کا پہلا مرحلہ محاسبۂ نفس ہے، یعنی اس بات کی جانچ، پرکھ اور تلاش کہ میں کسی کے حُسن کا پرستار اور فریفتہ کیوں بن گیا؟ جس دل والے کو اس بات کا صحیح جواب مل جائے، وہ نقاد ہے اور جو نقاد اس صحیح بات کو لفظوں کی مدد سے دوسروں کے دل میں اُتار سکے، وہ اچھا نقاد۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کی محبت، شیفتگی اور پرستاری کا داخلی سفر انہیں مرحلوں سے گزر کر

طے کیا ہے اور ان کی سلامتی طبع نے حُسن بیان کو اپنا رفیق بنا کر اپنے محسوسات کی پوری دنیا کو، دوسروں کے محسوسات کی دنیا تک پہنچا دینے کا معرکہ سَر کیا ہے۔ غالب کے کلام کے مطالعے سے قاری جن جن نازک تجربات میں سے گزرتا ہے، انہیں ادراک سے اظہار میں منتقل کرنے کی سعادت کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بلاشبہ فرمان فتح پوری کی تنقید اس قابلِ رشک معلومات کی حصہ دار ہے۔

فرمان صاحب نے غالب کو شاعر امروز و فردا کہہ کر محض تحسین و توصیف کا رسمی فریضہ ادا نہیں کیا۔ ان کی تحقیق اور تنقید روایتی آداب و رسوم کو محترم سمجھنے اور ان کی پیروی اور پابندی کرنے کے معاملے میں بڑی قدامت پسند ہے لیکن قدامت پسندی کے اس میلان کو انہوں نے سوچ سمجھ کر اور اس سے جذباتی طور پر ہم آہنگ ہو کر اختیار کیا ہے۔ کسی شاعر کو بہ یک وقت شاعرِ امروز و فردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیانی فصل و بعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانونِ فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ یہ جتنی تیز، جتنی دُور بیں اور جتنی دُور رس ہوگی، اسی حد تک شاعر کے فکر و تخیل اور جذبے میں رسائی کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جس کی بدولت وقت کی طنابیں کھینچ کر ماضی، حال اور مستقبل کو ایک نقطے پر لے آتی ہیں۔ آج کا شاعر ہر دَور کے انسان کے جذبے کا ترجمان بن جاتا ہے اور اس کی شاعری میں ہر دَور کے انسان کے احساس کی تعبیر کا وصف پیدا ہو جاتا ہے۔ لفظوں کے پردے میں چھپے ہوئے معانی کی تہیں یوں کھلتی ہیں کہ ہر انسان انفرادی طور پر اور ہر عہد بہ حیثیت مجموعی ان میں اپنی محرومی، اپنے غم، اپنی آرزو اور اپنے عزم کی تصویریں دیکھتا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعرِ امروز و فردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کو احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

بالکل شخصی سطح پر فرمان صاحب نے غالب کو ایک بطلِ عظیم کے پیکر میں دیکھا ہے اور اس کی ذات میں انہیں محبوبی کے جلوے بھی نظر آئے ہیں اور ان دونوں حیثیتوں کی انہوں نے پوری فراخدلی سے داد دی ہے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیق اور تنقید دونوں کا دامن افراط و تفریط کی دست بُرد سے محفوظ رہا ہے۔

(۱۹۷۱ء)

پروفیسر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ڈاکٹر فرمانِ فتح پوری اور غالب شناسی

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے پندرہ مقالات پر مشتمل ایک مجموعہ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ستمبر ۱۹۷۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ پروفیسر سید وقار عظیم کے لفظوں میں، کسی شاعر کو بیک وقت شاعرِ امروز وفردا کہلائے جانے کا حق صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ اپنے دل کی دھڑکنوں میں ہر انسان کے دل کی آواز سن سکے اور جب اس کی نظر آج کے انسان اور کل کے انسان کے درمیان فصل و بُعد سے گزر کر اس رشتے کا مشاہدہ کر سکے جس میں قانونِ فطرت نے ہر عہد کے انسان کو منسلک کیا ہے۔ فرمان صاحب نے غالب کو اسی مفہوم میں شاعر امروز وفردا کہا ہے اور ان کی تحقیق کی خوش تدبیری اور تنقید کی خوش تعبیری نے ان کے احساس اور دعوے کو خوش بیانی کی صورت دی ہے۔

(نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۶۰۴)

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس تواتر اور انہماک کے ساتھ تنقید اور تحقیق کو اپنا شغل اور شعار بنایا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری کسی یونیورسٹی کے کسی اُردو شعبے سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ غالب سے فرمان صاحب کو ایک گونہ شغف ہے۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' ان کے اسی مدۃ العمر کے عشق کا مظہر ہے۔ پندرہ مقالات پر مشتمل اس کتاب کے بعض خالصتاً تحقیقی مضامین، غالب کی زندگی کے بارے میں نئی معلومات کے حامل ہیں، بعض ایک نئے تنقیدی زاویے سے غالب کے فکر وفن کے مخفی گوشوں کو سامنے لاتے ہیں اور بعض مضامین میں تحقیق وتنقید، دونوں کے خوشگوار امتزاج سے قابلِ قدر نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

غالب صدی پر بلا مبالغہ کئی سو کتابیں لکھی گئیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے، خود میرے ذاتی ذخیرۂ غالبیات میں صرف غالب صدی کے موقع پر شائع ہونے والی دو سو سے زیادہ

کتابیں (یا کتابی اہمیت کی چیزیں) موجود ہیں لیکن بقا صرف ان چیزوں کے لیے ہے جو عالمِ انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں۔ غالب پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ کتاب ان کے کم و بیش ایک چوتھائی صدی کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ فرمان صاحب کے نقطۂ نظر میں تازگی اور اُسلوب میں توانائی ہے اور اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اہم کتاب، غالب صدی پر شائع ہونے والی ان سینکڑوں کتابوں میں سے ایک ہے جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ یہ کتاب پاکستان اور پاکستان سے باہر دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں اضافی مطالعے کے لیے تجویز کی گئی ہے اور بہت شوق سے برابر پڑھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔

غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا پہلا معلوم مقالہ ''غالب کے کلام میں استفہام'' کے موضوع پر ہے۔ ''غالب، شاعر امروز وفردا'' میں شامل ان کا یہ مقالہ چالیس بیالیس برس پہلے رسالہ 'نگار' لکھنؤ، شمارہ مئی ۱۹۵۲ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ نہ صرف اپنے موضوع پر غالبیات میں پہلا مقالہ اور مطالعہ ہے بلکہ اب چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی معنوی دلپذیری اور اس کی شادابی اور تازگی میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔

کلام غالب کے استفہامیہ لب ولہجہ کے بارے میں اس خیال افروز اور خیال انگیز مقالے نے غور وفکر کی راہیں سجھائیں اور بعد کے نامور نقادوں نے اس چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے رسالہ ''غالب نامہ'' دہلی (شمارہ جولائی ۱۹۸۷ء) میں فرمان صاحب کا حوالہ دیے بغیر ''اندازِ گفتگو کیا ہے؟'' کے عنوان سے غالب کے طرزِ استفہام کا مطالعہ کیا ہے۔ عاصمہ اعجاز نے بالکل درست کہا ہے کہ ''شمس الرحمٰن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک بہت معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' (مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھنا لطف اور بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ان کی ایک کتاب تحقیق وتنقید (کراچی ۱۹۶۳ء) نیز ان کی ایک دوسری اہم کتاب ''غالب: شاعرِ امروز وفردا'' (لاہور ۱۹۷۰ء) میں بھی شامل ہے۔ یہ مقالہ ''تنقید غالب کے سو سال'' نامی کتاب (مرتبہ فیاض محمود پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء) میں بھی منتخب ہوا۔

(غالب نامہ، تجزیاتی مطالعہ، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۴ء)

میں فرمان صاحب کے اس مقالے کو غالبیات کے بیسویں صدی کے نصف آخر کے اہم ترین مطالعات میں شامل اور شمار کرتا ہوں۔

مئی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ مقالہ ''نگار'' (لکھنؤ) کے صفحات پر اوّل اوّل سامنے آیا اور ہند تا سندھ لہر در لہر تحسینی مباحث کا باعث ہوا۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی رسالہ ''نگار'' لکھنؤ کی ذہنی زندگی کے عجائبات میں سے تھا۔ اونچے طبقے میں صاحب علم اور صاحبِ ذوق ہونے کی پہچان یہ تھی کہ ''نگار'' کا خریدار ہو اور اس کی رایوں پر بحث کرسکتا ہو۔ ''نگار'' محض ادبی جریدہ نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک رجحان، ایک قدر تھا۔ ''نگار'' کا نام ندوۃ العلماء سلطان المدارس اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ لیا جاتا تھا اور ''نگار'' میں مضمون چھپ جانا ویسا ہی تھا جیسا کہ ان علمی اداروں سے سند مل جائے۔

(نگار پاکستان، کراچی، نیاز نمبر، حصہ اوّل، سالنامہ ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اسی ''نگار'' سے مئی ۱۹۵۲ء میں ان کے مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام'' کی اشاعت پر ادبی تنقید کی سند ملی۔ یہ چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے جب کہ آج کے بہت سے نامور غالب شناسوں نے غالب پر لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ یا غالب سے متعلق ان کی کوئی قابلِ ذکر تنقیدی تحریر، اس وقت (۱۹۵۲ء کے نصف اوّل) تک سامنے نہیں آئی تھی۔ مجھے نہیں خیال کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، کالی داس گپتا رضا، ڈاکٹر وحید قریشی، مرتضیٰ حسین، فاضل لکھنوی، ڈاکٹر گیان چند، اُسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، اکبر علی خاں عرشی زادہ اور قدرت نقوی ایسے ممتاز غالب شناسوں کی غالب سے متعلق کوئی قابلِ لحاظ تنقیدی تحریر ۱۹۵۲ء سے پہلے شائع ہو کر توجہ کا مرکز بنی ہو۔

''غالب: شاعر امروز و فردا'' میں فرمان صاحب کے پندرہ مقالے شامل ہیں جو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۹ء تک کا حاصل ہیں لیکن یہ اس عرصے کا کُل حاصل نہیں۔ غالب کے بارے میں بہت سی تحریریں اس کتاب میں شامل نہیں۔ مثلاً اس جگہ فرمان صاحب کی ان تحریروں کے چند حوالے بے محل نہ ہوں گے:

۱۔ غالب کا ایک غیر معروف قطعہ، افکار نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء۔
۲۔ غالب و انیس کا زمانہ، رباعی کا ایک اہم دَور، مشمولہ: اُردو رباعی ۱۹۶۲ء۔
۳۔ جدید اُردو غزل، غالب سے حالی تک، سالنامہ نگار، کراچی ۱۹۶۵ء۔
۴۔ غالب اور دوسرے مضامین (تبصرہ) نگار، کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء۔
۵۔ جہانِ غالب (تبصرہ) نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء۔

۶۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی، سیپ، کراچی، شمارہ ۸۔

۷۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب (تبصرہ) نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء۔

۸۔ احوال ونقدِ غالب (مقدمہ رتبصرہ) نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۶۷ء۔

۹۔ غالب وسرسید، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵رنومبر ۱۹۶۸ء۔

پھر ۱۹۶۹ء کے بعد اب (۱۹۹۴ء) تک غالب کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مختلف مواقع اور حوالوں سے اتنا کچھ مزید لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ایک مستقل مجموعے کو کفایت کرے لیکن یہاں میں ان کے صرف ایک مقالے کا ذکر کروں گا۔ ''کیا دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ واقعی جعلی ہے؟'' کے عنوان سے ڈاکٹر فرمان کا یہ معرکہ آرا تحقیقی مطالعہ، رسالہ ''غالب'' کراچی (شمارہ ۸، ۹، سال ۷۷-۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا۔ اس مقالے کے مشمولات سے جزوی یا کلی اختلاف ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بحث ہے جس کا یہ محل نہیں لیکن یہ مقالہ فرمان صاحب کی جرأتِ اظہار کی بہت اچھی مثال ضرور ہے اور اس موضوع پر بلاقیدِ مقام اور وقت جہاں اور جب بھی بحث ہوگی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے اس مقالے سے صرف نظر نہیں کیا جا سکے گا۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ غالب کے بارے میں فرمان صاحب ہنوز برابر سوچ رہے ہیں، لکھ رہے ہیں اور ان کا قلم آج بھی غالب کی کھوج میں رواں دواں ہے۔ چنانچہ پچھلے دو برسوں میں تنقید غالب کے سلسلے میں ان کے بعض اہم مقالات شائع ہوئے ہیں، مثلاً:

۱۔ ہم عصر سماجی مسائل کا ادراک اور غالب

(غالب نامہ (دہلی) جولائی ۱۹۹۲ء، سالنامہ صریر کراچی، ۱۹۹۱ء)

۲۔ غالب کے اثرات جدید اُردو شاعری پر

(سہ ماہی تمثال (کراچی)، شمارہ ۹ر۴، جلد ۱، ۱۹۹۳ء)

۳۔ غالب کی شاعری اور مسائلِ تصوف

(سالنامہ ''صریر'' کراچی، بابت جون، جولائی ۱۹۹۳ء)

۴۔ کلامِ غالب میں لفظ ''تمنا'' کی تکرار

(خاص نمبر، اوراق، لاہور، ۱۹۹۳ء)

کہنا یہ ہے کہ فرمان صاحب نے ''غالب، شاعر امروز وفردا'' کی اشاعت کے بعد پچھلے ۲۴، ۲۵ برس میں بھی غالب سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا، اگرچہ وہ صرف غالب ہی کے ہو کر

کبھی بھی نہیں رہے، انہوں نے ایک موقع پر کہا ہے کہ:

> ''غالب کی شخصیت یک پہلو نہیں، ہشت پہلو ہے، ان کا فن یک رنگ نہیں صد رنگ ہے، ان کی ادبیت یک شیوہ نہیں، ہزار شیوہ ہے، ان کی ذات یک صفت نہیں، جامع الصفات ہے، اُردو میں ان کی اوّلیات ایک دو نہیں متعدد ہیں اور شعروادب پر ان کے احسانات دوچار نہیں، بے شمار ہیں۔''

میں یہی بات خود فرمان صاحب کے بارے میں کہتا ہوں، محض کہتا ہی نہیں، اس پر ایمان بھی رکھتا ہوں۔

(۱۹۹۴ء)

پروفیسر اسلم انصاری

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی غالب شناسی کے چند پہلو

مرزا غالب کی عظمت فکروفن اُردو شعروادب اور اُردو تنقید کے مسلمات میں سے ہے اگر چہ ان کے کلام کی تفہیم کا عمل ان کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا لیکن غالب شناسی کا آغاز صحیح معنوں میں مولانا حالی کی گراں قدر تصنیف ''یادگارِ غالب'' سے ہوا اس اعتبار سے گزشتہ سوا صدی کی مدت کو غالب فہمی اور غالب شناسی کا زمانہ بھی کہا جاسکتا ہے اگر چہ میر پر غالب اور اقبال سے کہیں کم لکھا گیا ہوگا لیکن میر، غالب اور اقبال اُردو کے منفرد اور عظیم شعراء ہیں جن کے مطالعے نے اُردو شعروادب کے بہترین اذہان کو مصروف رکھا اور جن کے بارے میں لکھی گئی تنقید سے اُردو نقد وادب میں فکرونظر اور نقد وتحسین کے کئی نئے راستے کھلے۔ اس اعتبار سے اُردو تنقید سب سے زیادہ غالب اور اقبال کی رہین منت ہے۔ جن کے فکروفن کا مطالعہ اُردو تنقید کے سرمائے میں روز افزوں اضافے کا باعث ہے اس میں شکل نہیں کہ اُردو تنقید کا دائرہ کار موضوعات کے اعتبار سے گزشتہ ایک ڈیڑھ صدی میں بہت وسیع ہوا ہے اور اُردو کے تمام اہم اور قابل ذکر شعراء کی طرف قابل قدر نقادوں کی توجہ مبذول ہوتی رہی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو غالب اور اقبال دو ایسے دائروں کے مرکزی نقطے دکھائی دیتے ہیں جو بہت زیادہ نقاط پر ملتے ہیں اور بہت کم نقاط پر جدا ہوتے ہیں غالب کا مطالعہ ناگزیر طور پر اقبال کے فکروفن کے پہلوؤں کے مطالعات کو شامل ہو جاتا ہے اور اقبال کا مطالعہ ناگزیر طور پر غالب شناسی کی راہوں پر لے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود غالب اور اقبال اپنی اپنی دنیاؤں کے خالق ہیں اور بہت سی مماثلتوں کے باوجود اپنی اپنی انفرادیت کے پرتو سے ممتاز اور منور ہیں۔ غالب شناسوں کی بزم میں ایک متعین صف ان کے شارحین کی بھی ہے جن کی کاوشوں نے نقد غالب کی دشوار گزار راہوں کو آسان کیا ان میں پھیر پیدا کیے، اسی طرح غالب کے سوانح نگاروں نے تاریخ وتہذیب کے بہت سے ناشناختہ پہلوؤں کو

بے نقاب کیا یا کم متعارف حقائق کو روشن کیا بعض ناقدین غالب نے غالب کے فن اور بعض نے فکر و فلسفہ اور بعض نے دونوں سے اعتناء کیا غرض تحقیق و تنقید اور تاریخ و سوانح نگاری کے کتنے ہی اسالیب صرف مرزا غالب کی بدولت وجود میں آئے مثلاً ''محاسنِ کلامِ غالب'' ایسا تنقیدی اور انشائی شاہکار (بعض انتہا پسندانہ رویوں کے باوجود) صرف غالب ہی کی وجہ سے وجود میں آسکا۔ شعر و ادب کے بدلتے ہوئے تصورات اور نقد ادب کے بدلتے ہوئے اسالیب نے بھی غالب کے فکر و فن کو ہر اعتبار سے اہم اور گراں مایہ پایا چنانچہ اس صدی کی چوتھی دہائی میں وجود میں آنے والی ترقی پسندی تحریک سے لے کر عصر حاضر تک اُردو تنقید کے لیے مرزا غالب کے فکر و فن اور شخصیت کی کشش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ہر دَور ہر تحریک اور ہر نسل نے مطالعہ غالب کا حق ادا کرنے کی اپنی سعی کی ہے اور یہ سعی کسی حال میں بھی بے ثمر یا لاحاصل ثابت نہیں ہوئی عظیم شاعری کی سب سے بڑی نشانی بھی یہی ہے کہ اس کی روشنی میں آنے والا نہ صرف یہ کہ ظاہر میں اپنے آپ کو منور پاتا ہے بلکہ اپنے اندر کی روشنی سے بھی بقدر ظرف و استطاعت روشناس ہو جاتا ہے۔ گزشتہ چار یا پانچ دہائیوں میں غالب کے جن نقادوں نے اپنی متانت فکر اور وسعت نظر کے اعتبار سے شہرت پائی یا استناد کا درجہ حاصل کیا ہے ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بھی ہے جن کے ہاں تحقیق و تنقید کے امتزاج نے ایک ایسے نقطہ نظر کی حیثیت اختیار کر لی ہے جو جامعیت کی تعریف کے بہت قریب ہے پھر حاضر کے غالب شناسوں میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو اپنے نقطۂ نظر کی پختگی اور ممکن حد تک معروضیت اور تجزیاتی طریق کار کی بدولت ایک خاص اہمیت اور انفرادیت حاصل ہے۔

مرزا غالب کی شاعری میں فلسفیانہ افکار کی تلاش و استخراج اور دنیا کے بعض بڑے مفکروں کے خیالات و نظریات کے ساتھ ان کی تطبیق پیدا کرنے کے سلسلے میں اولیت کا سہرا شاید بجنوری ہی کے سر ہو، تاہم یہ کام پوری وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کیا (افکار غالب) اور غالب کے ایک ایک شعر پر بعض اوقات ایک ایک باب لکھا اور دنیا کے اکثر عظیم فلسفیوں کے افکار کے ساتھ غالب کی جزوی یا کلی مشابہت ثابت کی لیکن غالب کے کلام میں کس مربوط نظام فکر کی تعیین شیخ محمد اکرام نے کی اور اس کے بعد اس سلسلے کو کافی فروغ حاصل ہوا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بعض اہم مقالات میں بھی غالب کے کلام سے بعض مربوط سلسلہ ہائے خیال کے استخراج کی سعی مشکور دکھائی دیتی ہے اس سلسلے میں ان کا پہلا مضمون ''غالب کے کلام

میں استفہام'' ہے بقول ان کے مئی ۱۹۵۲ء میں نگار (لکھنؤ) میں شائع ہوا اس مضمون کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''یہ مضمون غالب اور غالبیات کے باب میں میرے اس
طویل مطالعے اور مسلسل غور وفکر کا حاصل تھا جسے میں ہائی
سکول کی طالب علمی کے زمانے سے اپنائے ہوئے تھا
میرے حق میں یہ غالب کا احسان اور مطالعہ غالب کا فیضان
تھا کہ میرے اس مضمون کو تنقید غالب کے سلسلے میں بالکل نیا
اور چونکا دینے والا مضمون خیال کیا گیا ہمارے علمی و ادبی
حلقوں کی طرف سے داد دی گئی اور مجھے غالب کے حوالے
سے پہچانا جانے لگا۔''

اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے مرزا غالب کے ایک ذہنی رجحان یعنی استفسار پسندی کا پہلی بار ایک تفصیلی مطالعہ پیش کیا اور طرز سوال کو غالب کے شعری لہجے کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت قرار دیا لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس مضمون کو انہوں نے متنی تنقید کے اُصولوں تک محدود رکھا اور اس تجزیاتی طریق کار سے کام نہ کیا جو ہمیں ان کے بعض دوسرے اہم مضامین میں بروئے کار آتا دکھائی دیتا ہے یعنی غالب کی استفسار پسندی کی ذہنی روش کے نفسیاتی محرکات سے پسند نہیں کیا گیا اس کے باوجود اس مضمون کی اہمیت اور معنوی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مضمون جو ان کے مجموعہ مقالات تحقیق و تنقید (۱۹۶۲ء) میں شامل ہوا غالبیات کے حوالے سے ان کے اولین مجموعہ مقالات ''غالب شاعر امروز و فردا'' کی زینت بنا اور ان کے دوسرے مجموعہ مقالات غالبیات ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' میں بھی اس کی تلخیص شامل کی گئی۔ ڈاکٹر فرمان صاحب مطالعہ غالب سے اپنی وابستگی کو زمانہ بد شعور تک لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''طبعاً تو میں غالب کے دعویٰ نبوت

گر شعر و سخن بہ ہر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر ایں فن سخن دین بودے
آن دین را ایزدی کتاب این بودے

پر اس وقت ایمان لے آیا تھا جب کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر (دیباچہ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، ص X) گویا غالب کے فکر و فن کا مطالعہ ان کی ذہنی اور عملی زندگی کا حاصل ہے غالب ان کے لیے ایک دائمی رہنمائے فکر کی حیثیت رکھتا ہے وہ اس کے فکر و فن سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور اس روشنی کو زندگی اور شعر و ادب کی تحسین و تفہیم میں صرف کرتے ہیں اگر وہ زندگی کے تضادات کو سمجھنے کے لیے ہیگل اور میتھو آرنلڈ ___ اور اقبال اور مجنوں گورکھ پوری کا مطالعہ بھی کرتے ہیں لیکن زندگی کی حقیقی جدلیت ان پر غالب کے ایسے اشعار کے مطالعے سے واضح ہوتی ہے:

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

اس طرح اگرچہ محاکاتِ شعری کے سلسلے میں انہوں نے مقدمہ شعر و شاعری اور شعر العجم میں بہت پڑھا تھا لیکن ذوق کی تشفی اور ذہن کی سیرابی غالب کے اس طرح کے شعروں سے ہوئی:

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
رنگ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا!

غرض معاشی عدم مساوات سرمایہ و محنت کی کشمکش رجائیت و قنوطیت کی کشاکش کائنات میں ارتقائے حیات اور معارف و حکم، فکر انسانی کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ان کے ذوق تفہیم و تحسین کی تسکین مطالعہ غالب ہی سے ہوئی ہے ایسا نقاد جو اپنی ذہنی اور عملی زندگی میں کسی ایک شاعر کے کلام کو منارہ نور اور آئینہ ہدایت قرار دیتا ہے اس شاعر کے بارے میں داد تحقیق و تنقید دیتے ہوئے یقیناً بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے گا ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سرمایہ نقد غالب ایسی ہی بہترین صلاحیتوں کا اظہار ہے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب کے سرمایہ نقد غالب کو بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

یعنی (۱) تحقیقی اور (۲) تنقیدی۔ یعنی وہ مقالات جو بنیادی طور پر تحقیقی ہیں اور وہ جو بنیادی طور پر تنقیدی ہیں البتہ یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تحقیق وتنقید دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جس تنقید کی اساس تحقیق پر نہ ہو وہ اکثر پادر ہوا ثابت ہوتی ہے اور جس تحقیق کو تنقید کی روشنی نصیب نہ ہو وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان صاحب تحقیق کی روشنیوں کو جانتے ہیں اور تنقید کے تقاضوں کو بھی سمجھتے ہیں اس لیے ان کے تحقیقی مضامین میں تنقید کی چاشنی اور تنقیدی مضامین میں تحقیق کی روشنی بدستور موجود رہتی ہے۔

ان کے تحقیقی مقالات میں درج ذیل مقالات خاص اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ غالب کے اولین تعارف نگار (مشمولہ غالب شاعر امروز و فردا)
۲۔ غالب اور غالب تخلص کے اُردو شعر (ایضاً)
۳۔ مکمل شرح دیوان غالب پر ایک نظر (ایضاً)
۴۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز (ایضاً)
۵۔ غالب کے حالات میں پہلا مضمون (ایضاً)
۶۔ غالب کے اثرات جدید اُردو شاعری پر (مشمولہ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب)
۷۔ کیا دیوان غالب نسخہ امروہہ واقعی جعلی ہے؟ (ایضاً)

اس طرح تنقیدی مقالات میں ذیل کے مقالات انفرادی خصوصیت کے حامل ہیں:

۱۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ (مشمولہ غالب شاعر امروز و فردا)
۲۔ غالب کے کلام میں استفہام (ایضاً)
۳۔ غالب شاعر امروز و فردا (ایضاً)
۴۔ غالب اور گنجینہ معنی کا طلسم (ایضاً)
۵۔ کلام غالب میں تمنا کی تکرار (ایضاً)
بطور استعارہ فلسفہ آثار (مشمولہ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب)
۶۔ کلام غالب میں استفہام (ایضاً)
۷۔ غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا (ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کے مقالات میں دو مقالے الگ نوعیت کے ہیں جن میں انہوں نے غالب اور اقبال کے فکر وفن کا مطالعہ کیا ہے۔ ان مقالات کی اپنی اہمیت ہے ''غالب کے اولین

تعارف نگار'' اور ''غالب اور غالب تخلص کے شعرا'' درجہ اول کی تحقیق کے نمونے ہیں اول الذکر مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے مولانا حالی کی اس روایت کا تجزیہ کیا ہے جس کی رو سے میر تقی میر نے غالب کے بارے میں کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل گو ہو جائے گا۔ انہوں نے مولانا غلام رسول مہر اور مالک رام کی تنقیحات کا جائزہ لیا ہے اور مالک رام کی تائید کی ہے جنہوں نے مولانا حالی کی روایت کو بہ دلائل درست ثابت کیا ہے۔ غالب کے ابتدائی کلام اور ابتدائی معاصرین اور تذکرہ نگاروں کی آراء کو اس مضمون میں تنقیدی تحلیل و تجزیہ کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور نقد غالب کی ابتدائی صورتوں کے مطالعے کے لیے یہ مقالہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ ثانی الذکر مقالہ (غالب اور غالب تخلص کے شعراء) بھی غیر معمولی کاوش سے لکھا گیا ہے اور غالب تخلص کے دس شعراء کے حالات اور نمونہ کلام پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک تو خود مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں اور باقی ''نو غالبین'' کے تراجم اور نمونہ ہائے کلام مختلف تذکروں سے لیے گئے ہیں اس مضمون میں بعض ایسے اشعار پر بحث کی گئی ہے جو یا غالب کے ہیں اور دوسرے غالب تخلص شعراء سے منسوب ہو گئے ہیں اور یا غالب تخلص کے دوسرے شعراء کے ہیں اور غالب کے نام سے مشہور ہیں۔

تنقیدی مقالات کے مطالب و مباحث اور ان کی طوالت و ضخامت کو دیکھا جائے تو تحقیقی مقالات کے مقابلے میں ان کا پلہ بھاری نظر آتا ہے ان مقالات کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کو لکھتے ہوئے پہلے سے کسی نقطہ نظر کی پابندی یا کسی پہلے سے طے شدہ نظریے کے اطلاق کو لازمی قرار نہیں دیا گیا بلکہ زیادہ تر داخلی شواہد سے کام لیا گیا ہے البتہ ہر مرحلہ استدلال میں معروف و ممتاز نقادان غالب کی آراء و استدلال کو ضرور سامنے رکھا گیا اور ان سے تائید و تردید کا کام لیا گیا ہے۔ اس خصوصیت نے ان مقالات کو نقد غالب کے ایک تنقیدی جائزے کی صورت بھی عطا کر دی ہے ان مقالات میں ہر چند جگہ جگہ غالب سے جذباتی وابستگی اپنی جھلک دکھاتی ہے اس کے باوجود ممکن حد تک معروضی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے بالخصوص ''غالب کا نفسیاتی مطالعہ'' معروضی نقطہ نظر کی ایک خوبصورت مثال ہے مقالہ اگرچہ محبت اور ہمدردی کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن غالب کی زندگی کے داخلی اور خارجی تضادات پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور اس کی کسی کمزوری کو معاف نہیں کیا گیا۔ اصل میں اس مضمون کا لاشعوری محرک غالب کے بارے میں کچھ ایسے مقالات اور تاثرات ہیں جن میں لکھنے والوں نے غالب کے بارے بہت سخت بلکہ

بعض صورتوں میں معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے اگرچہ معاشی حوالے سے لکھی گئی غالب کی بعض تحریروں کے پیش نظر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو بھی وہ ''پرلے درجے کے خوشامدی اور بھاٹ'' اور ''واقعی گداگر'' معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے مرزا کے تضادات فکر و وضع زیست کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اکثر شعراء کے ہاں یہ تضاد موجود رہا ہے اور رہتا ہے ان کا یہ انتباہ خاصا وزنی ہے کہ اپنے بارے میں کہی ہوئی مرزا غالب کی ہر بات کو اس کے ظاہر محمول نہ کیا جائے بلکہ اس بات کی تہ داری پر غور کیا جائے اور اصل ایما تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اس سلسلے میں ان کا استدلال ہے کہ اگر مرزا غالب اپنی فارسی شاعری کے مقابلے میں اُردو شاعری کو ''بے رنگ'' قرار دیتے ہیں تو یہ ایک پیچیدہ بیان ہے اس کو اس کے ظاہری معنوں میں قبول نہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ مرزا کی تمام تر شہرت مقبولیت اور عظمت کا انحصار ان کے اُردو کلام پر ہے۔ جن لوگوں نے ان کے اُردو اور فارسی کلام کو ساتھ رکھ کر پڑھا ہے وہ بھی بنیادی حوالہ اُردو شاعری ہی کو بناتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اگر مروّجہ دیوان کی ''نسخہ حمیدیہ'' تفہیم نہ کرے تو صرف مروجہ دیوان سے ان کے فکر و تخیل کے تمام الوان کا احاطہ کرنا مشکل ہو جائے گا اس کے باوجود جن لوگوں کو غالب کے فارسی کلام کے غائر مطالعے کے مواقع حاصل ہیں وہ بشدت ان کے فارسی کلام کی برتری کے قائل ہیں جب دوسرے اصحاب ذوق و نظر کی یہ صورت ہے تو خود مرزا غالب جو فنی اعتبار سے بلا مبالغہ خود آگہی کے بلند ترین مراتب پر فائز تھے کس طرح اس حقیقت سے آگاہ نہ ہوں گے البتہ اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غالب نے یہ موازنہ اپنی اُردو اور اپنی فارسی شاعری کے درمیان کیا ہے اس موازنے سے خود اُردو شاعری کے تناظر میں ان کی اُردو شاعری کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں ہو جاتی بہر حال ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بہت حد تک جرأت مندی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ ان (غالب) کے یہاں طرزِ عمل کا تضاد زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے'' نیز یہ کہ اقوال و بیانات خواہ وہ ان کے اشعار میں ہوں یا نثر میں نہایت گمراہ کن ہیں ان میں وقتی مصلحتوں اور دُور اندیشیوں کا بڑا دخل ہے اس لیے ان کی تردید یا تائید سے پہلے ان کی دوسری تحریروں پر نظر ڈال لینا چاہیے۔''

ان کے معروف مقالے ''کلامِ غالب میں استفہام'' کو ہر نقطۂ نظر کے غالب شناس نے پسند کیا ہے اور اس کی تحسین کی ہے غالب کے حکیمانہ ذہن میں تلاش حقیقت کے لیے جو اضطراب طبعی طور پر موجود تھا اس کی رہنمائی زیادہ تر اس انداز استفہام میں ہوتی ہے غالب کے ان

استفہامی لہجوں اور اسالیب کو پہلی بار ڈاکٹر فرمان صاحب نے یکجا کیا اور ان کا مطالعہ بطور ایک فنی حربے کے کیا ہے۔ یہ ایک قابل قدر مطالعہ ہے طرز استفہام خطابت اور شاعری دونوں کا حُسن ہے اس سے خطاب اور شاعری دونوں میں ڈرامائیت پیدا ہوتی ہے اور محاکاتی تفصیل کی تکمیل ہوتی ہے مرزا غالب سے بڑھ کر طرز استفہام کا نکتہ شناس کون ہوسکتا تھا انہوں نے اس اُسلوب کو اس کے تمام تر تنوعات کے ساتھ بھرپور انداز میں استعمال ہے۔ متذکرہ مقالے کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے کہ غالب کے ہاں استفہام ایک فنی حربے کے طور پر استفہام اور فلسفیانہ انداز تفکر کے طور پر کیا اہمیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے دوسرے مجموعہ مقالات نقد غالب کا سب سے اہم وہی ہے جس سے کتاب کا عنوان اخذ کیا گیا ہے یعنی ''کلام غالب میں لفظ تمنا کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار'' اس قابل قدر مقالے میں غالب کی آرزو مندی اور تمنا پسندی کا دقت نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے اور کلام غالب میں لفظ ''تمنا'' کی معنویت پر بہت قیمتی بحث کی گئی ہے اور بہت اہم سوال اُٹھائے گئے ہیں اس مضمون میں ان کا تعارفی جملہ بہت بلیغ ہے کہ ''ان (غالب کی) سرشت و مزاج کا وہ پہلو جو انہیں بہرگام بہرروش جدت پسند، فلسفہ طراز، مستقبل بیں و فروشناس، خودبین و آزادہ رو ہر لحہ متغیر و متجسس اندیشہ ہائے دُور و دراز میں غلطاں اور مشاہد حق کے گفتگو میں از خود رفتہ بنائے رکھتا ہے دراصل لفظ ''تمنا'' سے اُجاگر ہوتا ہے کسی دوسرے لفظ سے نہیں ہوتا گویا ''تمنا'' کا لفظ غالب کے یہاں محض وسیلہ حسن تکرار نہیں بلکہ معنی کی سطح پر ایک استعارہ فلسفہ آثار بھی ہے۔ (ص ۱)

غالب کی اُردو شاعری میں واقعی اس لفظ کی حیثیت کلیدی ہے تنہا یا ترکیب کے جزو کے طور پر غالب نے اس لفظ کو جہاں بھی استعمال کیا ہے معنویت کی ایک خوبصورت اور تہہ دار صورت وجود میں آگئی ہے دیکھا جائے تو غالب کے ہاں بھی ''تمنا'' کا لفظ اور تصور جرمن مفکر شاپن ہائیر کی طرح وجود کی ناتمام کا استعارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس لفظ کو غالب کے ہاں فلسفہ آثار کا استعارہ قرار دیتے ہیں اگرچہ اس بے حد وقیع مضمون میں فلسفہ آثار کی اصطلاح کی تشریح نہیں کی گئی تاہم بظاہر اس سے فلسفہ مظہریت یا مظہریت پسندی ہی مراد ہوسکتی ہے جو عصر حاضر کے اہم اور مقبول فلسفیانہ دبستان میں سے ہے یہ دبستان ظاہر اور باطن مظہر اور مظہر کی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا اس کے نزدیک مظاہر اور آثار ہی اصل حقیقت ہیں کیونکہ ہمارے مشاہدے

کی گرفت میں یہی مظاہر ہی آتے ہیں مرزا غالب اگر چہ ظاہر اور باطن یا ظہور و بطون کی تفریق کے قائل ہیں اور بطون یا معنویت (خبر سے) زیادہ سروکار رکھنے کا ادعا رکھتے ہیں لیکن ظہور و آثار کی رنگینی اور بوقلمونی کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں:

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی

اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے!

مرزا کو آئینے کے تمثال دار ہونے کی خصوصیت جس حد تک مسحور کرتی اور رکھتی ہے اس کی روشنی میں ان کے شوق تمنا کو ان کے فلسفہ آثار کے ساتھ مربوط کر کے دیکھنا بے جا نہیں بلکہ ان کی ایک خاص فکری جہت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں فاضل نقاد نے شارحین غالب کی بعض تشریحات کو بھی شامل بحث کیا ہے اور اس طرح ''لفظ تمنا'' کی مختلف معنوی پرتوں کو آشکار کیا ہے یوں تو اس مضمون کے بیش تر حصے یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن طوالت کے خوف سے (اگر چہ اس سے بھی کچھ تطویل ہو ہی جائے گی) صرف دو مربوط پیراگراف ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظ تمنا کے حوالے سے...... ساری بحث کو ذہن میں رکھیے تو کہنا پڑتا ہے کہ غالب کے یہاں تمنا کا لفظ محض آرزو، خواہش، شوق اشتیاق، محبت، عشق، طلب، جذب، جنون، لگن، لگاؤ، دھن اور مستی وغیرہ کا سادہ مترادف نہیں ہے بلکہ اس سے بڑی وسعت ہے اور یہ دراصل استعارہ ہے حرکت و فعالیت کا تحرک و تغیر کا خود اعتمادی اور خود اختیاری کا، ناسازگار حالت سے ستیزہ کاری کا، زندگی سے بہر حال، وابستہ رہنے کا اور اسے تسخیر کرنے کا، شرر سے ستارہ اور ستارے سے آفتاب تک پہنچنے کا خوب سے خوب تر کی تلاش میں خود کو کھوئے رکھنے کا، آدمی کو محشر خیال سمجھنے کا اور ارادہ و عمل میں اسے مختیار جاننے کا، لاانتہا کی انتہا تک پہنچنے کا، آرزومندی کا، بے نہایت حصول کے لیے کوشاں رہنے کا ذہن انسانی کی رسائیوں کو بے کراں جاننے کا، اور اس کی فتح

مندی و کامرانی پر یقین رکھنے کا، زمانے کی ناہنجاری کا
مقاومت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا اور یاس و نا اُمیدی کی
تاریک فضا میں رجائیت واُمید کے چراغ جلائے رکھنے کا۔

گویا غالب کے یہاں تمنا کا لفظ کم وبیش وہی معنی رکھتا
ہے جو اقبال کے یہاں شوق و آرزو یا عشق وجنوں کا مفہوم
ہے جس طرح اقبال کے یہاں عشق کسی اضطرابی کیفیت کا
نام نہیں بلکہ زندگی کے ایک طاقتور محرک کا نام ہے بالکل اسی
طرح غالب کے یہاں تمنا کا لفظ محض سادہ سی آرزومندی
کے معنی نہیں رکھتا بلکہ یہ فطرت انسانی کے اس ذوق طلب اور
شوق بے پایاں کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی کو متحرک اور
با معنی بنائے رکھتا ہے۔ نت نئے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے پھر
ان مقاصد کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ عمل
صبر آزما ہونے کے باوجود اسے درماندہ نہیں کرتا بلکہ اس میں
زندگی کی ایک تازہ لہر دوڑا دیتا ہے۔'' (ص ۱۸-۱۹)

''غالب کا انداز فکر اور استقبال فردا'' بھی ایک فکر انگیز مضمون ہے جس میں غالب کی جدت پسند ذہنیت کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کیا گیا ہے ان کے مشاہدے، تجزیے اور طرز تفکر کی لطیف کیفیتوں کے امتیازات واضح کیے گئے ہیں اور زبان والفاظ کے ترک واستعمال سے لے کر خوب وناخوب کے عمومی معائیر تک غالب کی جدت طرازی اور ترقی پسندانہ مزاج کو واضح کیا گیا ہے۔ غالب کے مخصوص ذہنی رجحانات اور اسالیب بیان کی روشنی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بجا طور پر غالب کو آج ہی نہیں کل کا شاعر بھی قرار دیا ہے غالب کے فکر وفن کے اس پہلو کا مطالعہ ان کے ایک اور مضمون ''غالب شاعر امروز و فردا'' میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ غالب کے کلام میں ہمارے معاشرے کے تاریخی ارتقاء اور اجتماعی رویوں کی تبدیلی کا ساتھ دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہے جو اسے ہر عہد کا شاعر ثابت کرتی ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے دونوں مجموعہ ہائے مقالات یعنی ''غالب شاعر امروز و فردا'' اور ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب'' ان کے وسیع تر اور عمیق تر مطالعہ غالب کے ساتھ ساتھ ایک روشن

تنقیدی اُفق کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ان کے یہ مقالات نقدِ غالب میں بلا مبالغہ ایک قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اُسلوبِ تنقید کے سلسلے میں ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ وہ اصطلاحات اور اندازِ بیان کے بوجھل پن سے بہت گریز کرتے ہیں اور کسی طے شدہ فریم ورک پر پورا اترنے کے مقابلے میں متون زیرِ مطالعہ سے، فریم ورک حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر کے اس اصل مدعا سے کہیں بھی دُور نہیں ہوتے اس کے باوجود ان کے اندازِ بیان کی علمیت اور نقادانہ سنجیدگی بدستور برقرار رہتی ہے مطالب و مباحث اندازِ بیان اور نقطۂ نظر کی ممکنہ حد تک معروضیت ان کی تنقیدات کو اور بالخصوص ان کے نقدِ غالب کو جو توازن اور وقار و اعتبار عطا کر رہا ہے وہ بہت کم نقادوں کے حصے میں آتا ہے۔

پروفیسر افضح وحید

بسلسلۂ غالب، ڈاکٹر فرمان کے غیر مرتّب مقالات و متعارفات

مقالات

''فرمان صاحب کا مضمون پڑھنے کے بعد قاری کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ ان کے مضامین کی اپنی ایک زندگی اور چلت پھرت ہوتی ہے۔ ان کے مضامین ہانپتے نہیں تیز رفتار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی علمیت کا مظاہرہ نہیں کرتے، سیدھی سادی دلیلیں دیں اور مضمون ختم!''

(سجاد باقر رضوی)

''بحثیت محقق، نقاد اور غالب شناس ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے قلم کی قلم رو بہت وسیع ہے۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر)

''فرمان صاحب غالب کو بہت مانتے ہیں مگر اس سلسلے میں غالب کے اس مصرعے کی معنویت کو منوانے پر اصرار نہیں کرتے کہ

وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

وہ نشتر کی آب داری کو ترجیح دیتے ہیں۔''

(رشید حسن خان)

غالب کے فکروفن اوران کی ذات وخدمات کے بارے میں ڈاکٹرفرمان فتح پوری کے مقالات کے دومجموعے چھپ چکے ہیں۔ پہلا ۱۹۷۰ء میں اور دوسرا ۱۹۹۵ء میں، لیکن غالب کے بارے میں فرمان صاحب کے کچھ مقالات ایسے بھی ہیں جو غالب سے متعلق ان کے مجموعہ ہائے مضامین میں شامل نہیں ہو پائے۔اس باب میں ایسی چند غیر مرتب اور متفرق تحریروں کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

[۱]

''غالب۔۔۔نو دریافت بیاض کی روشنی میں'' کے زیرعنوان ڈاکٹرفرمان فتح پوری کا نیم تنقیدی و نیم تحقیقی نوعیت کا حامل مقالہ ۱۹۷۱ء میں ''نقوش'' (لاہور) کے غالب نمبر۳، شمارہ ۱۱۶ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مذکورہ مقالہ ڈاکٹرفرمان فتح پوری کی تصنیف ''نیااور پرانا ادب'' جو ۱۹۷۴ء میں کراچی میں شائع ہوئی، کی زینت بنا۔

زیرنظر مقالے میں ڈاکٹرفرمان فتح پوری نے ''غالب صدی'' کے سلسلے کی ایک نئی دریافت ''دیوان غالب بخط غالب'' کے حوالے سے غالب کی انفرادیت کو اُجاگر کیا ہے۔ یہ دریافت محمد طفیل مدیرِنقوش کی مساعی سے منظرعام پر آئی اور اسے کئی ناموں مثلاً ''نسخۂ عرشی زادہ''، ''نسخۂ بھوپال بخط غالب''، ''نسخۂ امروہہ''، ''غالب کی نو دریافت بیاض'' اور ''نسخۂ لاہور'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ڈاکٹرفرمان فتح پوری کے مطابق اس پر درجنوں تحقیقی مقالے لکھے گئے اور لکھے جارہے ہیں جو اِن متعدد سوالات کے بساط بھر جوابات فراہم کرتے ہیں جو غالب کی ''نو دریافت بیاض'' کے مطالعے کے وقت قاری کے ذہن میں اُبھر سکتے ہیں۔ البتہ بیاض کا تنقیدی نقطۂ نظر سے کوئی قابل ذکر جائزہ نہیں لیا گیا اور یہ باور نہیں کرایا گیا کہ اس کی اصل اہمیت کن وجوہات کی بدولت ہے۔

ڈاکٹرفرمان فتح پوری اس مقالے میں ''بیاض'' کی اہمیت صرف غالب کے ہاتھ کا ایک قدیم مخطوطہ ہونے تک محدود نہیں کرتے بلکہ اسے غالب کے مرتبۂ شاعری اور ادعاتِ فن کے ثبوت میں نئی دلیلوں اور تاویلوں کا موجب قرار دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف غالب کے ارتقائے فکروفن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ غالب کے بہت سے بے دلیل دعوؤں کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ دعویٰ کہ ان کی غزل عموماً بارہ (۱۲) بیت سے زیادہ اور نو (۹) شعر سے کم نہیں ہوتی اور یہ کہ ان کی غزلیں کسی استاد کی زمین کی بجائے طبع زاد زمینوں میں ہیں۔ ڈاکٹرفرمان

کے مطابق غالب کا یہ دعویٰ ان کی قوت متخیلہ اور جولانیٔ طبع کا پتہ دیتا ہے۔

مذکورہ بیاض کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے پیش نظر غالب کے صاحب دیوان ہونے کی عمر پورے چھ سال کم ہوگئی کیونکہ نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے مطابق غالب نے اپنا دیوان پچیس (۲۵) برس کی عمر میں مرتب کیا تھا جب کہ اس بیاض کی روشنی میں اس وقت غالب کی عمر اُنیس (۱۹) سال سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر فرمان نے چند اشعار کی معنوی تہہ داری کو بیان کرتے ہوئے غالب کی عظمت کو اس بیاض کی روشنی میں دوبالا کیا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے پیش نظر یہ اشعار پچیس (۲۵) برس کی عمر کی مشقِ سخن کا نتیجہ تھے لیکن اس بیاض کے مطابق انیس (۱۹) برس کی عمر کا حاصل ہیں۔ مذکورہ اشعار کی اہمیت کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''یہ اشعار ہر چند کہ انیس سال یا اس سے بھی کم عمری کی تخلیق ہیں لیکن بلحاظِ عمر اتنے بلند پایہ ہیں کہ اگر غالب ان کے سوا اور کچھ نہ کہتے تو بھی ان کے موجودہ مرتبہ شاعری میں فرق نہ آتا۔ وجہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں سے متعدد ایسے ہیں جن کا حوالہ دیئے بغیر غالب کی عظمتِ شاعرانہ کا ذکر آج بھی مکمل نہیں کیا جا سکتا۔'' (۱)

مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر:

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ''بیاض'' کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ حالؔی کی بیان کردہ اس روایت کو کہ میر تقی میرؔ نے غالب کے اشعار سُن کر ان کی طباعی پر حیرت کا اظہار کیا تھا، مستند قرار دیتی ہے۔ اس روایت کو حالی (۲)، مالک (۳)، امتیاز علی عرشی (۴) اور خود غالب (۵) کے بعض بیانات و اقوال کے باوجود بھی بعض ناقدین کی طرف سے ناقابلِ اعتبار قرار دیا جا رہا تھا لیکن ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''نو دریافت بیاض کی موجودگی میں میرؔ کی بابت حالؔی کی بیان کردہ روایت کو باور کرنے میں تامّل کی گنجائش نہیں رہتی۔'' (۶)

جو شخص انیس (۱۹) برس کی عمر میں ایسا قابل قدر دیوان مرتب کر سکتا ہے، وہ اگر بارہ (۱۲)، تیرہ (۱۳) برس کی عمر میں قابلِ توجہ اشعار کا موجد قرار پاتا ہے تو یہ عین قرین قیاس ہے کہ ڈاکٹر فرمان نے زیر نظر مقالے میں غالب کے نو (۹) اشعار کا حوالہ دیا ہے جو بعض تذکروں اور شہادتوں کی موجودگی میں انیس (۱۹) برس کی عمر سے پہلے معرض وجود میں آئے۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر:

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

ڈاکٹر فرمان کے خیال میں ''بیاض'' کی اہمیت اور انفرادیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے غالب کا بہت سا ایسا کلام سامنے آیا جس کا واحد مآخذ یہ بیاض ہے، اس میں پچیس (۲۵) غزلیں، چودہ (۱۴) رباعیاں اور متعدد منفرد اشعار شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان نے زیر مطالعہ مقالے میں غالب کے مذکورہ کلام کے حوالے تیئس (۲۳) اشعار کا حوالہ دیا ہے کہ جو نہ صرف غالب کے فکر و فن کے بعض پہلوؤں کی تفہیم میں مددگار ہیں بلکہ غالب کے فنِ شاعری کے عروج تک کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان نے اس ''نو دریافت بیاض'' کی پذیرائی اور اہمیت کو متعین کرتے ہوئے اس کے وجود پر متوقع الزام کا بھی دلائل سے جواب دے کر اس بیاض کو تنقیدی نقطۂ نظر سے غالب کے کمال فن کو سمجھنے کے سلسلے کی اہم دستاویز قرار دیا ہے۔ اگر غالب کے نقطۂ نظر سے ان اشعار کو ناقابلِ اشاعت اور ناقابلِ انتخاب سمجھا جائے تو غالب کی شاعرانہ عظمت کی بہت سی ناقابلِ تردید شہادتیں گوشہ گمنامی میں چلی جائیں گی۔ اس لحاظ سے وہ ناقدین جو غالب کے نقطۂ نظر سے حذف شدہ کلام کی اشاعت پر معترض ہیں، ان کی تشفی و تسلی کے لیے ڈاکٹر فرمان غالب کے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ

> ''ایک شاعر چونکہ اولاد معنوی ہونے کی حیثیت سے اپنے اشعار سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے، اس لیے اس کے لیے اپنے کلام کا انتخاب کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعراء نے اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے، عام طور پر خود کو رسوا ہی کیا ہے۔'' (۷)

اس ضمن میں وہ غالب کے علاوہ میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، قائمؔ، مصحفیؔ اور شیفتہؔ کا حوالہ دیتے ہوئے شاعر کے مقام کا تعین کرنے کے لیے اس کے کلام کے اس حصے کو پیشِ نظر رکھنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں جسے شاعر نے اپنے انتخاب سے حذف کر دیا ہے اور اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان کے مطابق ''نو دریافت بیاضِ غالب'' بھی قابلِ توجہ ہے۔

لمال احمد صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بیاض غالب کے تحقیقی جائزہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ تبصرہ نگار غالب پر اور بھی کچھ
اس موضوع سے متعلق لکھا گیا ہے، پوری طرح واقف
ہے۔''(۸)

[۲]

''نقش ہائے رنگ رنگ'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا تنقیدی نوعیت کا حامل مقالہ ''نگار'' اور ''ہماری زبان'' کے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

زیرِ مطالعہ مقالہ دراصل شاہ حسین عطا کے اس مقالے کا تنقیدی جواب ہے جو اس عنوان کے تحت ''کتابی دنیا'' کے اگست ۱۹۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اپنے مقالے میں شاہ حسین عطا نے غالب کے اس فارسی شعر

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ منست

کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی شرح اور تفہیم کے ضمن میں علماء ادباء کی شعر فہمی پر طنز کیا کیونکہ ان کے نزدیک اس شعر کا مفہوم ہرگز یہ نہیں کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اُردو پر ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے زیرِ نظر مقالے میں شاہ حسین عطا کی اس رائے کی تردید کی ہے اور نہ صرف مذکورہ شعر سے پہلے اور بعد کے اشعار، مختلف لغات اور غالب کے خطوط کے حوالوں سے اپنے مطمحِ نظر کو واضح کیا ہے بلکہ اس شعر کی باریک بینی سے وضاحت کرتے ہوئے اس بات کا تعین کیا ہے کہ

''اُردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرنے اور فارسی کے متعلق
''بین'' اور اُردو کے متعلق ''بگذر'' کا حکم لگانے کا منطقی نتیجہ کیا

اس کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے کہ غالب اپنے اُردو کلام کو
فارسی کلام سے گھٹیا خیال کرتے تھے۔''(۹)

غالب کا اپنے اُردو خطوط کے متعلق یہ دعویٰ کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا، بہت بعد کا ہے۔ ابتداً تو وہ اپنے خطوط کی اشاعت کے بھی مخالف تھے اور ان کی شہرت کو اپنی سخنوری کے منافی قرار دیتے تھے لہٰذا ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاہ حسین عطا کے اس نقطۂ نظر کو کہ غالب نے خطوط کے ضمن میں اُردو کو فارسی پر ترجیح دی ہے، بعید از قیاس قرار دیا ہے اور اس مقصد کے پیشِ نظر شاہ حسین عطا نے جس خط کا حوالہ پیش کیا تھا، وہ بھی ڈاکٹر فرمان کے پیشِ نظر مغالطہ آمیز ہے۔ چنانچہ شاہ حسین عطا جیسے اہلِ نظر کی اس رائے پر اظہارِ تعجب کیا ہے کہ انہوں نے خط کے:

''سیاق وسباق کو محذوف کر کے اپنے کام کی سطریں اس خط
سے نقل کر دی ہیں۔''(۱۰)

ڈاکٹر فرمان نے یہ بات واضح کی ہے کہ غالب نے اپنی فارسی دانی یا فارسی نظم ونثر کو اُردو نظم ونثر پر ہمیشہ ترجیح دی ہے اور اس حوالے سے شاہ حسین عطا کی آراء قابلِ اعتبار نہیں۔

[۳]

''رباعی کا ایک اہم دَور'' (غالب وانیس کا زمانہ) کے عنوان کے تحت ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ ان کی تصنیف ''اُردو رباعی'' (۱۹۶۲ء) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ تحقیقی نوعیت کا حامل ہے جس میں ڈاکٹر فرمان نے غالب وانیس کے عہد میں رباعی کی قدر و قیمت کا جائزہ لیا ہے کیونکہ یہ عہد رباعی کے لیے بہت مفید تھا جس نے رباعی کو اُردو شعر وسخن میں ایک بلند مقام عطا کیا۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دہلی میں غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ اور لکھنؤ میں انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام کے حوالے سے رباعی کی نوعیت اور رباعیات کے کہنے میں ان کے مقام کو متعین کیا ہے۔ غالب کی رباعیات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''غالب کے یہاں تو صرف چودہ پندرہ رباعیاں ہوں گی۔
دو چار حمد ونعت میں، ایک دو اہلِ بیت کی مدح میں، چند
بادشاہ کی تعریف میں۔ صرف تین چار رباعیاں عشقیہ ہیں، وہ
بھی پھیکی اور بے مزہ۔ یہی نہیں بلکہ ایک جگہ انہوں نے

> رباعی کے وزن میں دھوکہ بھی کھایا ہے۔۔۔غرض کہ شاعری
> کی وہ بلند سطح جو غالب کی غزلوں میں ملتی ہے، رباعیوں میں
> نظر نہیں آتی۔" (۱۱)

اس حوالے سے غالب کی دو رباعیوں کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ غالب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان ذوقؔ کی رباعیوں کو غالبؔ اور ظفرؔ دونوں سے بہتر قرار دیتے ہیں اور مومنؔ کی رباعیوں کے محاسن کو بیان کرتے ہوئے وہ اس حوالے سے مومنؔ کو غالبؔ اور ذوقؔ پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسی طرح لکھنؤ میں انیسؔ اور دبیرؔ کے کلام میں رباعیات کے معیار کو بیان کیا ہے اور مثالوں سے اس کی وضاحت بھی کی ہے۔

زیر نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مطمح نظر یہ واضح کرنا ہے کہ غالب و مومن اور انیس و دبیر کا عہد رباعی کے لیے بڑا سود مند ثابت ہوا کیونکہ:

> "دہلوی شعرا کی بدولت عشقیہ مضامین میں تنوع اور تازگی
> پیدا ہوئی۔ لکھنوی شعراء کے ہاتھوں اخلاقی اور مصلحانہ
> طرزِ فکر سے رباعی روشناس ہوئی۔" (۱۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق ان ادوار میں رباعی کی پذیرائی اس طور ہوئی کہ وہ دوسرے اصناف شعر کے ہم مرتبہ ہوگئی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی مذکورہ تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے نورین فردوس لکھتی ہیں:

> "فرمان صاحب کی اس کتاب میں تنقید کے ساتھ تحقیق بھی
> ملتی ہے اور غالب کے کلام اور زندگی کے بعض حقائق کا
> انکشاف بھی کرتی ہے۔" (۱۳)

[۴]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ایک مقالہ "پروفیسر حمید احمد خان اور مرزا غالب" کے عنوان سے "افکار" کے حمید احمد خان ایڈیشن میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے حمید احمد خان کی غالبؔ شناسی کے حوالے سے خدمات کا تذکرہ کیا ہے اور غالبؔ سے متعلق ان کے تعلق اور عقیدت کی اہمیت اور نوعیت کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح

پوری، حمید احمد خان کی خوبیوں کو گردانتے ہوئے ان کی وفات کو علم و دانش کی دنیا کا ایک ناقابل تلافی سانحہ قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں بیسویں صدی میں اُردو کے صرف دو شاعر ایسے ہیں جن کا کلام بیسویں صدی کے قارئین کے لیے غیر معمولی کشش کا سامان رکھتا ہے۔ ایک غالبؔ اور دوسرے اقبالؔ۔ پروفیسر حمید احمد خان ان دونوں شعراء سے گہری عقیدت رکھتے تھے بلکہ غالب کے لیے یہاں تک کہتے ہیں:

> ''میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔'' (۱۴)

غالب شناسی کے حوالے سے حمید احمد خان کا سب سے منفرد کام ''نسخۂ حمیدیہ'' کی نئی ترتیب و تدوین اور تازہ اشاعت ہے (۲)۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت مفتی انوار الحق کی نگرانی میں ۱۹۲۱ء میں بھوپال سے ہوئی۔ گو کہ یہ اشاعت بڑی احتیاط و اہتمام سے کی گئی لیکن پھر بھی چند نکات پر اہل نظر متفق نہ تھے لیکن ان کے متعلق حتمی رائے وقت، محنت اور دقت نظر کی طالب تھی۔ حمید احمد خان نے ۱۹۳۸ء میں بھوپال کے کتب خانے میں بیٹھ کر نسخۂ حمیدیہ کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کی ایک ایک سطر کا تقابلی مطالعہ کیا اور پھر اس کی از سر نو ترتیب و تدوین کی اور حواشی اور مقدمہ کے ساتھ اس کو شائع کیا۔ حمید احمد خان نے مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے کے دیباچے میں بیان کردہ چند خیالات کی تردید کر کے ان کی منطقی وضاحت بھی کی ہے اور مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ساتھ ہی بہت سی کمزوریوں کا ازالہ کیا ہے جو مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ نسخۂ حمیدیہ میں حمید احمد خان نے اہل تحقیق کے لیے قابل توجہ سوالات اُٹھائے ہیں اور ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کی تفتیش غالبؔ کے سلسلے میں بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ پروفیسر حمید احمد خان کو مفتی انوار الحق کے مطبوعہ نسخے پر فوقیت دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُردو زبان و ادب اور غالب سے دلچسپی رکھنے والوں پر پروفیسر حمید احمد خان کا ایسا احسان ہے جسے ادب کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔'' (۱۵)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تنقید غالب کے سلسلے میں حمید احمد خان کے ایک اور منفرد مقالے ''غالب کی شاعری میں حُسن وعشق'' کا حوالہ دیا ہے جو ابتدأ فروری ۱۹۴۹ء میں ''ہمایوں'' (لاہور) میں شائع ہوا اور نظر ثانی کے بعد ''تنقید غالب کے سو سال'' (۱۶) میں چھپا۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (۱۷) کے مقالے کے بعد غالب پر دوسرا اہم تنقیدی مقالہ ہے لیکن عبدالرحمٰن بجنوری کے مقالے کے برعکس اس کی نوعیت جذباتی نہیں بلکہ سنجیدہ فکر کی حامل ہے۔ اس مقالے میں حمید احمد خان حسن وعشق کے باب میں غالب کے اشعار کو عمق وتنوع کا حامل قرار دیتے ہیں اور ان کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں

''اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شعراء میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔'' (۱۸)

حمید احمد خان نے اپنے مقالے میں عکس ریزی کے لیے جگہ جگہ اشعار وامثال کے مرقعوں سے اپنی بات کو قابلِ اعتبار بنایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں حمید احمد خان نے نہ صرف غالب پر خود توجہ دی بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی چنانچہ بحیثیت وائس چانسلر حمید احمد خان کی سرپرستی میں مجلس یادگار غالب نے تصانیف غالب اور اس کے علاوہ تنقید غالب کے سلسلے کی چار کتابیں شائع کیں جن میں ''تنقید غالب کے سو سال'' (۱۹)، ''غالب ذاتی مشاہدات کے آئینے میں'' (۲۰)، ''اشاریہ غالب'' (۲۱) اور "Ghalib, a Critical Introduction" (۲۲) شامل ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مذکورہ کتابوں کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حمید احمد خان کی غالب سے دلچسپی کو سراہا ہے۔ حمید احمد خان کی نمایاں خدمات کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ اگرچہ حمید احمد خان نے تعلیم انگریزی کی حاصل کی مگر محبت اُردو سے کی اور مجلس ترقی ادب لاہور میں ناظم کی حیثیت سے اُردو کلاسیکس کے سلسلۂ اشاعت کو تیز کیا۔ اس کے علاوہ نہ صرف جشن غالب کے موقع پر اہم کتابیں شائع کیں بلکہ شدید مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں تاریخ ادبیات کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری حمید احمد خان کے انہی کارہائے نمایاں کا حوالہ دیتے ہیں اور خصوصاً تحقیق وتنقید غالب کے سلسلے میں ان کی خدمات کو اہلِ نظر کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رہنے کا موجب قرار دیتے ہیں۔

[۵]

''دیوان غالب سے بھی فال نکال سکتے ہیں'' کے زیرِعنوان مقالہ ''نگار'' کے ''غالب نمبر'' جنوری فروری ۱۹۶۹ء کا اداریہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ ''قومی زبان'' کراچی کی فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا۔

عام طور پر لوگ دیوان حافظ سے فال نکالتے تھے لیکن ڈاکٹر فرمان نے یہ کام دیوان غالب سے لیا ہے کیونکہ وہ عبدالرحمٰن بجنوری کی رائے:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان
غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے
جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے
تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔'' (۲۳)

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے غالب کے اس شعر کے مصداق قرار دیتے ہیں

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس نقطۂ نظر کی بدولت یہ مقالہ ایک آپ بیتی اور ''دیوان غالب'' سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ذاتی تاثرات کا عکاس ہے۔

غالب کے جشن صد سالہ (۱۹۶۹ء) پر ڈاکٹر فرمان ''نگار'' کا ''غالب نمبر'' نکالنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں غالب کی زندگی اور فن کے ہر پہلو پر اتنا کچھ لکھا جا چکا تھا کہ ان کے متعلق کوئی تازہ اور کارآمد مضامین کا فراہم کرنا آسان نہ تھا چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں غالب سے مشورہ لینے کی خاطر ''دیوان غالب'' سے فال نکالنے کا کام کیا اور یہ شعر سامنے آیا:

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

جس سے گویا غالب نے ''غالب نمبر'' نکالنے کی ممانعت کردی لیکن قارئین کے خطوط اور ''غالب نمبر'' نہ نکالنے کے سوالات پر انہیں دو مرتبہ اور فال نکالنے پر مجبور کیا مگر جواب بدستور ''نہ'' ہی ملا۔ پھر بعض ادیبوں نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ ''نیاز صاحب ہوتے تو

ضرور اس موقع پر کچھ کرتے۔" چنانچہ اس جملے نے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے لیے تازیانے کا کام دیا اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر "دیوان غالب" سے فال نکالی اور اس مرتبہ یہ شعر آیا:

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

گویا جواب مثبت میں آیا۔ اس وقت صرف ایک ماہ رہ گیا تھا لیکن اس مختصر مدت میں نہ صرف ڈاکٹر فرمان کو "نگار" کے "غالب نمبر" کی انفرادیت کی پیشین گوئی "دیوان غالب" نے دی بلکہ مضامین کے انتخاب میں بھی رہنمائی کی جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے یوں محسوس کیا:

"تیرے پاس تو غالب نمبر کا بڑا قیمتی ساز و سامان موجود ہے،
تو اس سلسلے میں بے وجہ پریشان ہے۔" (۲۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق "دیوان غالب ہی کی بدولت انہیں "روح غالب" کے سامنے سرخرو ہونے اور پرستارانِ غالب کی خوشیوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس طرح یہ مقالہ بالخصوص ڈاکٹر فرمان اور غالب کی قربت اور غالب سے ان کی محبت اور عقیدت کا ترجمان ہے۔

[۶]

"مولانا حامد حسن قادری مرحوم اور غالب شناسی" کے زیرِ عنوان مقالہ "نگار" پاکستان کی نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ تنقیدی نوعیت کے حامل اس مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مولانا حامد حسن قادری سے اپنی شناسائی کا ذکر کیا ہے جو مراسلے سے شروع ہو کر مکالمہ و ملاقات اور پھر عقیدت مندی تک پہنچ جاتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری "مولانا حامد حسن قادری کی ادبی خدمات کا "بقامت کہتر اور بقیمت بہتر" کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

زیرِ نظر مقالے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری مولانا حامد کی وضع دار اور شخصی اوصاف میں حالؔی کی قربت کو بیان کرتے ہوئے بطور خاص مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کے حوالے سے بحث کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں مولانا حامدؔ، غالبؔ کے شاگرد خاص مولانا الطاف حسین حالؔی سے بھی کئی اعتبار سے مماثلت رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بیسیوں صدی میں غالب شناسی کا محرک حالؔی کی "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) ہے، وہاں مولانا حامد حسن قادری کی غالب شناسی کا یہ حال ہے کہ حالؔی کی مانند:

''غالب کا نام کیا آتا، گویا جام آجاتا اور ان کے ہاتھ کی سب
لکیریں رگِ جاں بن جاتیں۔'' (۲۵)

اسی عقیدت کی بناء پر مولانا حامد نے غالب پر اس وقت قلم اُٹھایا جب ''یادگارِ غالب'' کے سوا اُردو انگریزی میں کوئی کتاب یا مقالہ وجود میں نہ آیا تھا۔ اس کے علاوہ غالبیات کے حوالے سے مولانا نے غالب کے اُردو فارسی دیوان سے اشعار کا انتخاب بعنوان ''غالب'' کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں یہ قابل قدر کام ہے کیونکہ یہ انتخاب ''دیوان غالب'' کے اس نسخے سے کیا گیا تھا جو غالب کی وفات سے پانچ (۵) سال پہلے ۱۸۶۴ء میں شائع ہوا اور اس کے پروف بقول مولانا حامد حسن قادری خود غالب نے پڑھے تھے۔ (۲۶)

مذکورہ مقالے میں غالب اور کلامِ غالب سے مولانا حامد حسن قادری کی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ رباعی اور تاریخ گوئی پر مولانا کی توجہ خاص کے علاوہ مولانا حامد کی تضمین نگاری کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں تضمین نگاری کے ضمن میں مولانا حامد کی توجہ زیادہ تر غالب کی طرف رہی اور انہوں نے غالب کی بعض پوری غزلوں کی تضمین کی ہے اور ایک ایک مصرع کی بجائے تین تین مصرع لگائے ہیں۔ پیش نظر مقالے میں چند مثالوں کو بطور حوالہ نقل کر کے کلامِ غالب کے سلسلے میں مولانا حامد کی تضمین نگاری کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے کہ:

''یادگارِ غالب اور محاسن کلام غالب کے درمیانی عہد میں غالب
شناسی اور غالب فہمی کا موثر ذریعہ خیال کی جاتی تھیں۔'' (۲۷)

مولانا حامد کی تضمین نگاری کے بیان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاہ دلگیر، مدیر ''نقاد'' کا بھی حوالہ دیا ہے جنہوں نے مئی ۱۹۱۴ء کے پرچے میں مولانا حامد کی تضمین نگاری کو سراہا۔

زیرِ نظر مقالے میں مولانا حامد حسن قادری کا بطور غالب شناس یہ طرۂ امتیاز بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں غالب پر جو لکھا گیا (بشمول شرحیں) اُن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اور ان کے عیوب و محاسن پر بھی روشنی ڈالی لیکن وہ غالب کے طرف دار ہی نہ تھے بلکہ انہوں نے کلام غالب سے زبان و معنی اور عروض و بیان کے معائب کو بھی تلاش کیا ہے اور اس پر کڑی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر ہی وہ غالب کو قدیم غزل کے مجدد اور جدید غزل کا محسن قرار دیتے ہیں۔ (۲۸)

متعارفات

۔۔۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کی شناسائی کو فروغِ
عام دینے میں کبھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔۔۔
ڈاکٹر انور سدید

۔۔۔غالبیاتی ادب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ایک خاموش
خدمت، غالب شناسوں کے جواہر کو از سرِ نو سامنے لانا، گویا
''نایاب کو دستیاب'' بنانا بھی ہے۔ انہوں نے ''نگار'' کے
وسیلے سے نیاز فتح پوری، حسرت موہانی، یگانہ، ڈاکٹر خلیق انجم،
صاد قین اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کے غالب سے تعلق کی
نوعیت اور اہمیت کو اُجاگر کیا اور خوب کیا!
ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری جہاں تحقیق و تنقید کے ذریعے اپنے متعدد مقالات اور ادبی نگارشات میں غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے ہیں، وہاں انہوں نے کئی غالب شناسوں کے جواہر بھی متعارف کروائے ہیں اور اس مقصد کے لیے ''نگار'' ایک موثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' کے مختلف شماروں میں علامہ نیاز فتح پوری، مولانا حسرت موہانی، میرزا واجد حسین یاس و یگانہ چنگیزی، صادقین، آفتاب احمد خاں، مختار الدین احمد، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے غالب سے تعلق کی نوعیت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ یہاں کچھ ایسے ''متعارفات'' کو زیرِ بحث لانا بے محل نہ ہوگا۔

[۱]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے علامہ نیاز فتح پوری کی شرح دیوان غالب بعنوان ''مشکلات غالب'' کو نایاب سے دستیاب صورت دینے کی غرض سے اس کا نصف اول حصہ ''نگار'' اکتوبر ۱۹۹۳ء کی اشاعت میں شائع کر دیا اور پھر ''نگار'' جنوری ۱۹۹۴ء کے شمارے کو اول الذکر شمارے کا ضمیمہ قرار دیتے ہوئے اسے ''مشکلات غالب'' کے بقیہ نصف حصے پر محیط کر دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ''مشکلات غالب'' کی اہمیت دو خاص پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں:

اول: اُردو کے ایک عظیم شاعر غالب کے کلام کی شرح ہے۔

دوم: بیسویں صدی کے ایک عظیم نقاد کی ترجمان ہے۔(۲۹)

اسی بناء پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے اس اقدام کو غالب اور نیاز دونوں کی تفہیم میں مددگار خیال کرتے ہیں۔

[۲]

مئی ۱۹۹۵ء کا ''نگار'' علامہ نیاز فتح پوری اور مولانا حسرت موہانی سے متعلق ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مئی میں مولانا حسرت موہانی (۳۰) اور علامہ نیاز فتح پوری (۳۱) کی رحلت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق یہ دونوں غالب کے شیدائی تھے اور دونوں نے کلام غالب کی شرح لکھی۔ اسی مناسبت سے مذکورہ شمارے میں مولانا حسرت موہانی (۳۲) اور علامہ نیاز فتح پوری (۳۳) دونوں کی شرحوں کے نمونے کے طور پر غالب کی متداولہ دیوان کی ۲۸ویں غزل تک کی شرح کی گئی ہے۔ یہ شمارہ مولانا حسرت موہانی اور علامہ نیاز فتح پوری کی غالب فہمی کا عکاس ہے۔ یہ شمارہ، حسرت، نیاز اور غالب سے ڈاکٹر فرمان کی محبت کا مظہر بھی ہے۔

[۳]

''نگار'' جنوری ۱۹۹۲ء کا شمارہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نیاز فتح پوری کے ایک مقالے ''غالب کی فارسی شاعری'' (تقابلی مطالعہ و محاکمہ) کے زیر عنوان شائع کیا ہے۔ یہ مقالہ غالب کی فارسی شاعری کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر فرمان کے خیال میں مذکورہ مقالہ فارسی شاعری میں غالب کے مقام و مرتبہ کو متعین کرتے ہوئے غالب کو اُردو کے ساتھ ساتھ، فارسی کا بھی عظیم المرتبت اور موثر شاعر ثابت کرتا ہے۔ اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''غالب کے اُردو کلام کے حق میں جو کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن
بجنوری کے مقالے ''محاسن کلامِ غالب'' نے کیا تھا، وہی کام
غالب کے فارسی کلام کے سلسلے میں نیاز فتح پوری کے اس
مقالے نے کیا۔'' (۳۴)

یہ مقالہ نیاز فتح پوری کی تنقیدی کتاب ''انتقادیات'' میں شامل ہے۔

[۴]

''نگار'' کا ۱۹۸۷ء کا سالنامہ ''غالب نمبر'' مطالعاتِ غالب سے متعلق نیاز فتح پوری کی تحریروں پر مشتمل ہے۔

غالب پر علامہ نیاز فتح پوری کی کوئی تالیف یا کتاب نہ ہونے کے باعث عام رائے یہ تھی کہ نیاز کو غالب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں اور اگر ہے بھی تو صرف اس قدر کہ وہ غالبؔ کو مومنؔ سے کم تر درجے کا شاعر خیال کرتے تھے کیونکہ علامہ نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۸ء میں ''نگار'' کا مومن نمبر شائع کیا تو اپنے مقالے کا آغاز اس طور پر کیا:

''اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا
کلام رکھ کر مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت
دی جائے تو بلا تامل کہوں گا کہ مجھے کلماتِ مومن دے دو اور
باقی سب اُٹھا کر لے جاؤ۔'' (۳۵)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری مذکورہ غالب نمبر میں علامہ نیاز فتح پوری کے غالب سے تعلق خاطر کو ان کی مختلف تحریروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ان میں ۱۹۳۲ء کا ''نگار''، ''غالب کی شوخیاں'' نمبر، اگست ۱۹۴۳ء کے ''نگار'' میں شامل نیاز فتح پوری کا معرکہ آراء مضمون ''نقش ہائے رنگ رنگ'' اور نیاز فتح پوری کی شرح دیوان غالب بعنوان ''مشکلاتِ غالب'' شامل ہے۔

علامہ نیاز فتح پوری کی غالب شناسی کے حوالے سے عام خیال اور مغالطے کو دُور کرنے کی غرض سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' ۱۹۸۷ء (سالنامہ) ''غالب نمبر'' میں ان تحریروں کو محفوظ کر دیا جو غالبؔ کے فکر و فن کے سلسلے میں نیاز فتح پوری نے لکھیں۔

[۵]

''نگار'' اپریل ۱۹۹۴ء کا شمارہ میرزا واجد حسین یاس ویگانہ چنگیزی سے متعلق ہے۔ یگانہ اُردو غزل کی تاریخ میں یکسر منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور غزل میں ان کا لہجہ اور اُسلوب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق سودا، آتش اور غالب کے لہجے کا سراغ دیتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں یگانہ کی مشہور کتاب ''غالب شکن'' کے پہلے ایڈیشن کو شائع کیا ہے۔

''غالب شکن'' حقیقتاً اپنی ابتدائی صورت میں ایک قدرے طویل خط تھا جو ۱۹۳۳ء میں مسعود حسن رضوی کے نام یگانہ نے لکھا تھا، پھر ۱۹۳۴ء میں اسے چھوٹی تقطیع کے بتیس (۳۲) صفحات میں بصورت کتابچہ شائع کر دیا تھا۔

''غالب شکن'' کا دوسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

ڈاکٹر نجیب جمال نے اس دوسرے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر اسے اپنے گراں قدر مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ اضافہ شدہ ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) دستیاب ہے لیکن پہلا ایڈیشن چونکہ بہتوں کی نظر سے ہنوز اوجھل ہے، چنانچہ اس ایڈیشن کو عام کرنے کی غرض سے ''نگار'' کے اپریل ۱۹۹۴ء کے شمارے میں پہلے ایڈیشن کی فوٹو کاپی ڈاکٹر نجیب جمال کے تفصیلی مضمون کے ساتھ شائع کی گئی تھی، جو میرزا واجد حسین یاس ویگانہ چنگیزی کی غالب پر تحقیق وتنقید کی نوعیت کو واضح کرتی ہے۔

[٦]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' فروری ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ''غالب کی شرحیں'' کے عنوان سے آفتاب احمد خاں کے مضمون کو متعارف کروایا ہے۔

مذکورہ مضمون میں آفتاب احمد خاں نے غالب کے اس ادّعا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہوئے اس کے جواز میں ''دیوان غالب'' کی شرح نویسی کا حوالہ دیا ہے۔ شرح نویسی کا یہ سلسلہ حیات غالب سے لے کر آج تک قائم ہے۔ غالب کی مکمل یا جزوی شرحوں کے حوالے سے آفتاب احمد خاں نے پچاس سے زائد شرحوں اور ان کے شارحین کے نام

اپنے مقالے میں درج کیے ہیں۔ اس حوالے سے مقالہ نگار نے کلامِ غالب پر ایسی تصنیفات کا بھی حوالہ دیا ہے جو دیوانِ غالب کی منظوم شرح کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ''دستِ زرفشاں'' پر تبصرے کا حوالہ دیا گیا ہے کہ

''صبا اکبر آبادی نے بھی دیوان غالب کی مکمل تضمین کی ہے
لیکن یہ ابھی طباعت و اشاعت کی منتظر ہے۔''(۳۶)

[۷]

''نگار'' پاکستان کا اکتوبر ۱۹۸۸ء کا شمارہ ملا۔ انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں غالب پر ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا مضمون ''دشمنانِ غالب اور غالب'' بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تفہیم و تحقیق غالب کے سلسلے میں کئی اعتبار سے فکر انگیز اور توجہ طلب قرار دیتے ہیں۔ اُردو ادب میں چونکہ بت پرستی کی روایت عام ہے اور غالب کے سلسلے میں بھی مروّج ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس روایت کے قائل نہیں۔ وہ حقائق کو سامنے لانے پر زور دیتے ہیں اور اسی حوالے سے ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے مضمون کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں:

''ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے پہلی بار اس طرف توجہ کی
ہے اور نہایت مدلل انداز میں اہل نقد و نظر کو کم سے کم
غالب کے سلسلے میں راہ اعتدال اختیار کرنے کا مشورہ دیا
ہے۔''(۳۷)

''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''انداز گفتگو کیا ہے؟'' شامل ہے اور ساتھ ہی اپنے مضمون ''کلام غالب میں استفہام'' کو بھی اسی شمارے میں شامل کیا کیونکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں غالب پر شمس الرحمٰن فاروقی کے مذکورہ مضمون اور ''کلام غالب میں استفہام'' کے درمیان توارد ذہنی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے(۳۸) اس مماثلت کے پیشِ نظر عاصمہ اعجاز نے بھی اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ

''شمس الرحمٰن فاروقی کے اس مضمون کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری
کے ایک معروف مقالے ''غالب کے کلام میں استفہام''

(مطبوعہ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء) کے ساتھ ملا کر پڑھا لطف
اور بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔" (۳۹)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور عاصمہ اعجاز کی اس رائے کی تائید ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن نے بھی کی ہے (۴۰) چنانچہ ڈاکٹر فرمان نے اسی نکتے کے جواز میں اپنے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون کو مذکورہ شمارے میں ایک ساتھ شائع کیا ہے۔

[۸]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "نگار" پاکستان کی اپریل ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر اسلم پرویز کی کتاب "بہادر شاہ ظفر" مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی کو متعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں یہ کتاب بہادر شاہ ظفر کی شخصیت اور شاعری کو پہلی مرتبہ پوری آب و تاب اور صداقت و حقائق کے ساتھ سامنے لاتی ہے۔

بہادر شاہ ظفؔر کی زندگی غالب سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔ اس تعلق کو بھی مذکورہ تصنیف میں بیان کیا گیا ہے۔ غالب، بہادر شاہ ظفؔر کے استاد تو ذوقؔ کی وفات کے بعد ہوئے لیکن قلعۂ معلّیٰ سے ان کا تعلق اس سے پہلے ہی قائم تھا۔

۱۲ر جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفؔر نے غالب کو "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطابات عطا کیے اور با قاعدہ ملازمت دے کر انہیں فارسی زبان میں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا۔ ۱۸۵۴ء میں ذوقؔ کے انتقال کے بعد شاہ ظفؔر، مرزا غالبؔ سے اصلاح لینے لگے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا جس کے بعد بہادر شاہ ظفؔر معزول کر کے رنگون بھیج دیئے گئے۔ (۴۱)

ڈاکٹر اسلم پرویز نے "بہادر شاہ ظفر" کے اساتذہ کے ضمن میں یہ واضح کیا ہے کہ ظفؔر کی شاعری پر شاہ نصیؔر، ذوقؔ اور غالبؔ کا اثر نسبتاً زیادہ تھا اور انہی اثرات نے ظفؔر کے مذاقِ سخن کو نکھارا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ڈاکٹر اسلم فرخی کی تصنیف "بہادر شاہ ظفر" کو متعارف کروانے کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظفر اور غالب کے تعلق کے حوالے سے غالب کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔

[۹]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ''نگار'' پاکستان کی فروری ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں مختار الدین احمد کے بارے میں اہم معلومات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب میں مختار الدین احمد کی ایک وجہ شہرت بطور غالب شناس بھی بتائی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر مالک رام کی مرتبہ کتاب ''نذر مختار'' سے مقالات کا انتخاب بھی کیا گیا ہے جن میں سے ''تصنیف و تالیف'' کے زیر عنوان مختار الدین احمد کی تصنیف میں غالب پر ان کی کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

غالب سے متعلق ان کے ادبی، علمی اور تحقیقی مضامین ''غالب نامہ'' کی زینت بنے۔ اس کے علاوہ مختار الدین احمد نے بعض رسالوں کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں جن میں مالک رام نے ''علی گڑھ میگزین'' ۱۹۴۸-۱۹۴۹ء کے ''غالب نمبر'' کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے (۴۲) جس کو بعد ازاں حذف و اضافے کے ساتھ ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

مالک رام کی مرتبہ ''نذر مختار'' کے علاوہ اُسلوب احمد انصاری بھی ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں شامل اپنے مضمون ''مختار الدین احمد: ایک دوست'' میں ان کا ذکر بطور غالب شناس کرتے ہیں اور مختار الدین احمد کی تصنیف ''احوال غالب'' میں غالب کے معرکتہ الآراء خاکے کو ایک تخلیق کا درجہ دیتے ہیں (۴۳)۔

مندرجہ بالا مشمولات کے پیش نظر ''نگار'' پاکستان ہ فروری ۱۹۸۹ء کا شمارہ مختار الدین احمد کے حوالے سے بہت سی مفید معلومات کے ساتھ ان کی غالب شناسی کا احاطہ کرتا ہے۔

[۱۰]

''نگار'' جولائی ۱۹۹۲ء کا اداریہ ''تصوف اور غالب'' کے عنوان سے ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غالب کے کلام میں تصوف کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے سید محمد مصطفیٰ صابری کی تصنیف ''غالب اور تصوف'' کی اہمیت کو نمایاں کیا ہے اور ساتھ ہی اس شمارے میں اس تصنیف کے چند اجزاء کو شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

غالب کی انفرادیت یہ ہے کہ غالب شناسی کا سلسلہ حیاتِ غالب سے تا حال جاری ہے بلکہ زیادہ جوش و خروش سے رواں دواں ہے۔ اس کی وجہ بلاشبہ غالب کی شخصیت اور شاعری

کے حیرت انگیز نکات ورموز ہیں۔البتہ ڈاکٹر فرمان کے مطابق غالب کے اس ادّعا:

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کی جانب سے بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ان کی نظر میں تصوف کے حوالے سے سید محمد مصطفیٰ صابری کی کتاب ''غالب اور تصوف'' قابلِ ستائش ہے۔ اس تصنیف کی اہمیت وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''صابری صاحب تصوف اور شاعری دونوں کے شناور معلوم ہوتے ہیں۔ تبھی انہوں نے اپنے موضوع سے ہر طرح انصاف کیا ہے اور غالب آگاہی کے ساتھ ساتھ تصوف کا ثبوت بھی دیا ہے۔'' (۴۴)

گویا ''نگار'' کے مذکورہ شمارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے سید محمد مصطفیٰ صابری کے غالب سے تعلق کی نوعیت کو متعارف کروایا ہے۔

[۱۱]

''نگار'' کا فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے کا اداریہ ''غالب کے خطوط'' کے عنوان سے ہے جس میں غالب کو عظیم شاعر کے ساتھ عظیم نثر نگار بھی بتایا گیا ہے۔غالب کی نثر جوان کے خطوط پر مشتمل ہے، انہیں اُردو کی عام نثری تاریخ میں بحیثیت صاحب طرز نثر نگار نہایت بلند وممتاز مقام عطا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان خطوط کی ترتیب وتدوین کی طرف بہت سے اہل علم نے توجہ دی۔ ان میں ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ ''غالب کے خطوط'' کے تنقیدی ایڈیشن کا تعارف کروایا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا تعارف اور ان کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحقیق وتنقید دونوں میں ان کے قلم کو رتبۂ اعتبار دیتے ہیں اور دو موضوعات کو ان کی خاص دلچسپی کا حامل قرار دیتے ہیں۔ ایک غالب اور دوسرے متنی تنقید۔ ان دونوں دلچسپیوں کا بھرپور اظہار ڈاکٹر خلیق انجم نے ''غالب کے خطوط'' کے تنقیدی ایڈیشن میں کیا ہے۔ساتھ ہی اس میں غالب کے خطوط کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس اداریئے میں غالب کے خطوط کے پہلے ایڈیشنوں کی

خصوصیات اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا ہے اور پھر ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ تنقیدی ایڈیشن کے امتیازات کو نمایاں کر کے ان کی انفرادیت کو اُجاگر کیا ہے۔

خطوطِ غالب کی ترتیب و تدوین کا یہ کام ڈاکٹر خلیق انجم نے کم و بیش پانچ سو صفحات کی چار ضخیم جلدوں میں مکمل کیا ہے، اس کی جلد اول کے متعلق ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں:

> ''جلد اول کا تحقیقی و تنقیدی مقدمہ سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے گویا ''خطوط غالب'' پر ایک مکمل کتاب ہے۔'' (۴۵)

''نگار'' کے اس شمارے میں ڈاکٹر فرمان نے ''غالب کے خطوط'' مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد اول کے مقدمے کا صرف ایک جزو متعارف کروایا ہے جس کا تعلق خطوط غالب کے مختلف ایڈیشن، املا کی خصوصیات اور بعض الفاظ کے استعمال سے ہے۔

مذکورہ مشمولات کے پیش نظر ''نگار'' فروری ۱۹۸۸ء کا شمارہ بلاشبہ ڈاکٹر خلیق انجم کی غالب شناسی کا اعتراف اور عکاس ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ''غالب۔نو دریافت بیاض کی روشنی میں''، مشمولہ ''نقوش'' غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۹۷۱ء، ص ۴۷۱۔

۲۔ ''یادگارِ غالب''، ص ۱۳۶، مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور۔

۳۔ ''ذکرِ غالب''، ص ۴۰۔

۴۔ ''دیباچہ نسخۂ عرشی''، ص ۱۳۔

۵۔ خط بنام بلگرامی مشمولہ ''خطوط غالب'' مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۴۶۰۔

۶۔ ''غالب۔نو دریافت بیاض کی روشنی میں''، ''مشمولہ'' نقوش، غالب نمبر ۳، شمارہ ۱۱۶، سال ۱۸۷۱ء، ص ۴۷۲۔

۷۔ ایضاً ص ۴۷۶۔

۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ایک تاثر''، مقالہ نگار کمال احمد صدیقی (دہلی) مشمولہ ڈاکٹر فرمان

فتح پوری (حیات وخدمات)، ترتیب وتدوین امراؤ طارق، جلد سوم، ص۲۴۱۔

۹۔ ''نقش ہائے رنگ رنگ''، مشمولہ ''نگار'' مارچ ۱۹۶۷ء، ص ۵۵۔

۱۰۔ ایضاً ص۵۶۔

۱۱۔ ''اُردو رباعی''، ص۸۱، مطبوعہ مکتبہ عالیہ، لاہور۔

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور محقق'' مقالہ نگار نورین فردوس، ۱۹۹۱ء (غیر مطبوعہ) ص۶۲۔

۱۴۔ ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتبہ حمید احمد خان، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۱۵۔ ''حمید احمد خان اور مرزا غالب'' مشمولہ ''افکار'' ۱۹۷۰ء، ص ۶۵۔

۱۶۔ ''مطبوعہ ''مجلس یادگار غالب'' پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء۔

۱۷۔ ''محاسن کلامِ غالب'' مشمولہ ''تنقید غالب کے سو سال''، ص۱۲۳-۱۵۳۔

۱۸۔ ''حمید احمد خان اور مرزا غالب'' مشمولہ ''افکار'' ص ۶۷، ۱۹۷۰ء۔

۱۹۔ مرتبہ فیاض محمود اور اقبال حسین، ۱۹۶۹ء۔

۲۰۔ مرتبہ عبدالشکور احسن اور سجاد باقر رضوی، ۱۹۶۹ء۔

۲۱۔ از سید معین الرحمٰن، ۱۹۶۹ء۔

۲۲۔ از سید فیاض محمود، ۱۹۶۹ء۔

۲۳۔ ''محاسن کلامِ غالب'' مشمولہ ''تنقید غالب کے سو سال''، ص۱۲۳۔

۲۴۔ ''دیوان غالب سے فال نکال سکتے ہیں'' مشمولہ ''نگار'' غالب نمبر، جنوری وفروری ۱۹۶۹ء، ص ۵۔

۲۵۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔

۲۶۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۔

۲۷۔ ''نگار'' پاکستان، نومبر ۱۹۶۶ء، ص ۳۳۔

۲۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بعض دوسری تحریروں کے لیے رجوع کیجیے:

(الف) غالب، ایک گم نام قطعہ، ''افکار نو'' کراچی، فروری ۱۹۶۱ء۔

(ب) غالب و سرسید، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء۔

(ج) غالب کی ایک غزل کے بارے میں استفسار کا جواب، ''نگار'' کراچی،

مارچ ۱۹۶۸ء۔

۲۹۔ ''ملاحظات''، نگار، اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۲۔

۳۰۔ ۱۳رمئی ۱۹۵۱ء

۳۱۔ ۲۴رمئی ۱۹۶۶ء

۳۲۔ ''شرح دیوانِ غالب''

۳۳۔ ''مشکلات غالب''

۳۴۔ ''نگار'' جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۶۔۷

۳۵۔ ''ملاحظات''؛ ''نگار''، نومبر ۱۹۸۷ء (سالنامہ) غالب نمبر

۳۶۔ ''کلام غالب کی شرحیں'' مضمون نگار: آفتاب احمد خاں، مشمولہ ''نگار'' فروری ۱۹۹۷ء، ص ۱۶

۳۷۔ ''نگار''، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۷

۳۸۔ ''نگار''، اکتوبر ۱۹۸۸ء، ص ۵

۳۹۔ ''غالب نامہ'' تجزیاتی مطالعہ تھیس، عاصمہ اعجاز، ۱۹۹۳ء

۴۰۔ ''ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور غالب شناسی'' مشمولہ ''نقوش غالب'' از سیّد معین الرحمٰن، ص ۲۵۹

۴۱۔ ''نگار''، اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۲

۴۲۔ ''نگار''، پاکستان، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۳۳

۴۳۔ ''نگار''، پاکستان، فروری ۱۹۸۹ء، ص ۶۴

۴۴۔ ''ملاحظات'' مشمولہ ''نگار'' شمارہ جولائی ۱۹۹۲ء، ص ۴

۴۵۔ ''ملاحظات'' مشمولہ ''نگار'' فروری ۱۹۸۸ء، ص ۴۔

عاصمہ وقار

غالبیاتِ فرمان کا اشاریہ
(۱۹۵۲-۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ولادت ۲۶؍جنوری ۱۹۲۶ء) کا غالب کے بارے میں پہلا مضمون ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا، تو وہ چھبیس (۲۶) برس کے تھے۔ اب کہ وہ بحمدہٖ عمر عزیز کی بہتر منزلیں طے کر چکے ہیں، غالب پر اُن کے ستّر کے لگ بھگ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان کے یہ علمی مضامین متعدد جگہ شائع ہوئے یا انتخابات میں لیے گئے۔ ان سب اشاعتوں کا شمار کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے ستر (۷۰) کے قریب مضامین ایک سو پچاس کے قریب رسائل و جرائد یا کتب میں شامل اور شائع ہوئے۔ پڑھنے والوں کی ایک سے زیادہ نسلوں پر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کے برسوں میں فرمان فتح پوری کی ان تحریروں نے جو اثرات مرتب اور مُرتسم کیے ہوں گے، اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

ذیل میں غالب سے متعلق اُن کے مضامین کا ایک اشاریہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشاریہ سازی کی یہ خدمت میں نے ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی رہنمائی میں انجام دی۔ یہ سارے حوالے مجھے گھر ہی میں ابو کے ذخیرۂ غالبیات میں ملے۔ کچھ حوالے ایسے ہوں گے جن تک، ابّو کے ذخیرے میں نہ ہونے کے باعث میری رسائی نہ ہو سکی ہو۔ اِس کا بھی امکان ہے کہ کچھ مزید حوالے یا تراشے ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کے کتاب خانے میں ہوں، لیکن میری نظر سے رہ گئے ہوں۔

اِس ''عرض مرتب'' کے بعد غالب کے بارے میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۷ء تک کی زمانی حد میں چھپنے والی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریروں کا سال بہ سال گوشوارہ ملاحظہ ہو:

[۱۹۵۲ء–۱۹۶۰ء]

۱۔ کلامِ غالب میں استفہام

۱۔ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۲ء
۲۔ تحقیق وتنقید، کراچی، ۱۹۶۳ء
۳۔ نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
۴۔ تنقید غالب کے سو سال (فیاض محمود)، لاہور، ۱۹۶۹ء
۵۔ غالب، شاعر امروز فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۶۔ نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۷ء
۷۔ نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
۸۔ ادیب، علی گڑھ، جنوری جون ۱۹۹۲ء
۹۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء
۱۰۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار (ڈاکٹر سلیم اختر) لاہور، ۱۹۹۸ء

۲۔ مکمل شرح دیوانِ غالب پر ایک نظر

۱۔ نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۴ء
۲۔ غالب، شاعرِ امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء

۳۔ غالب کے مقطعے

۱۔ ساقی، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء
۲۔ غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء

۴۔ غالب اور اقبال

۱۔ نگار، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۵۵ء
۲۔ غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۳۔ نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
۴۔ نگار، کراچی، سالنامہ دسمبر ۱۹۹۰ء

۵۔ غالب اور اقبال (۲)

۱۔ نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۵۶ء
۲۔ غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۳۔ نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
۴۔ نگار، کراچی، سالنامہ دسمبر ۱۹۹۰ء

۶۔ غالب کے اُسلوبِ سخن کا ایک پہلو: طنز	۱۔	نگار، لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۷ء
	۲۔	نگار، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۷ء
	۳۔	نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
	۴۔	غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
	۵۔	نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۷ء
	۶۔	نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
	۷۔	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء

[۱۹۶۱ء–۱۹۶۸ء]

۷۔ غالب کا ایک گم نام قطعہ	۱۔	افکارِ نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء
۸۔ غالب کا نفسیاتی مطالعہ	۱۔	نگار، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۱ء
	۲۔	(کافر نہ بود) فروغِ اُردو، لکھنؤ، غالب نمبر، ۱۹۶۸ء
	۳۔	غالب۔ شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۹۔ اقبال اور غالب کا تقابلی مطالعہ	۱۔	نگار، لکھنؤ، جنوری ۱۹۶۲ء
	۲۔	غالب۔ شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
	۳۔	نگار، کراچی، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
	۴۔	نگار، کراچی، سالنامہ دسمبر ۱۹۹۰ء
۱۰۔ رباعی کا ایک اہم دَور: غالب و انیس کا زمانہ	۱۔	اُردو رباعی، طبع اوّل، کراچی ۱۹۶۲ء
	۲۔	اُردو رباعی، طبع دوم، لاہور، ۱۹۸۲ء
۱۱۔ جدید اُردو غزل: غالب سے حالی تک		نگار، کراچی، جولائی اگست ۱۹۶۵ء
۱۲۔ غالب اور دوسرے مضامین (نظیر حسنین زیدی)		نگار، کراچی، ۱۹۶۶ء
۱۳۔ جہانِ غالب (کوثر چاندپوری)		نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۶ء
۱۴۔ مولانا حامد حسن قادری اور غالب شناسی	۱۔	نگار، کراچی، نومبر ۱۹۶۶ء
	۲۔	سیپ، کراچی، شمارہ ۸، ۱۹۶۶ء
	۳۔	باضافہ: ادبیات و شخصیات، لاہور، ۱۹۹۳ء

۱۵۔ غالب: نقش ہائے رنگ رنگ	۱۔	نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۷ء
	۲۔	ہماری زبان، دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء
۱۶۔ احوال ونقدِ غالب (حیات سیال)		نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۶۷ء
۱۷۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب (شاداں بلگرامی)		نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء
۱۸۔ غالب سے متعلق ایک خط اور اس کا جواب		نگار، کراچی، مارچ ۱۹۶۸ء
۱۹۔ غالب وسرسیّد		ہماری زبان، دہلی، ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء
۲۰۔ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تجویز	۱۔	ہماری زبان، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۸ء
	۲۔	قومی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء
	۳۔	ہندوستانی ادب، حیدرآباد دکن، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
	۴۔	غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
	۵۔	سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء

[سالِ غالب ۱۹۶۹ء]

۲۱۔ غالب نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں	۱۔	ماہِ نو، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
	۲۔	غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۲۔ غالب کے اوّلین تعارف نگار	۱۔	اُردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء
	۲۔	غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
	۳۔	سورج، لاہور، ۱۹۹۶ء
۲۳۔ دیوانِ غالب سے فال	۱۔	اداریہ، نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء
	۲۔	قومی زبان، کراچی، فروری ۱۹۸۱ء
۲۴۔ غالب کے حالات میں (بعد وفات) پہلا مضمون	۱۔	العلم، کراچی، جنوری - جون ۱۹۶۹ء
	۲۔	غالب، شاعر امروز وفردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲۵۔ غالب اور گنجینۂ معنی کا طلسم	۱۔	نقوش، لاہور، غالب نمبر ۱، ۱۹۶۹ء
	۲۔	نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۹ء

	٣۔	غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ١٩٧٠ء
٢٦۔ غالب، شاعرِ امروز و فردا	١۔	شاعر، بمبئی، غالب نمبر، ١٩٦٩ء
	٢۔	ہمدردِ صحت، کراچی، جون ١٩٦٩ء
	٣۔	غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ١٩٧٠ء
	٤۔	تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ١٩٩٥ء
٢٧۔ اے کاش کبھی۔۔ (میں اور غالب)	١۔	غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں (شکور احسن)، لاہور، ١٩٦٩ء
	٢۔	راوی، لاہور، غالب نمبر، اپریل ١٩٦٩ء
	٣۔	غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ١٩٧٠ء
	٤۔	محمل، مجلہ اسلامیہ کالج برائے خواتین، کوپر روڈ لاہور، ١٩٧٠ء
	٥۔	جزو دیباچۂ کتاب ''تمنا کا دوسرا قدم اور غالب''، ١٩٩٥ء
٢٨۔ فلسفۂ کلام غالب (شوکت سبزواری)		نگار، کراچی، جون ١٩٦٩ء
٢٩۔ غالب ڈائری یو پی ایل،		نگار، کراچی، جون ١٩٦٩ء
٣٠۔ غالب اور مطالعۂ غالب (عبادت بریلوی)		نگار، کراچی، اگست ١٩٦٩ء
٣١۔ نذرِ غالب (عطاء الرحمٰن کاکوی)		نگار، کراچی، اگست ١٩٦٩ء
٣٢۔ ہنگامۂ دل آشوب: بسلسلۂ غالبیات (قدرت نقوی)		نگار، کراچی، ستمبر ١٩٦٩ء
٣٣۔ محاسنِ کلام غالب (بجنوری)		فخری ایڈیشن، نگار، کراچی، اکتوبر ١٩٦٩ء
٣٤۔ صحیفہ، غالب نمبر ١-٣		نگار، کراچی، اکتوبر ١٩٦٩ء
٣٥۔ غالب اور غالب تخلص کے دوسرے شعراء	١۔	صحیفہ، لاہور، اکتوبر ١٩٦٩ء
	٢۔	غالب، شاعر امروز و فردا، لاہور، ١٩٧٠ء

[١٩٧٠ء-١٩٦٩ء]

٣٦۔ پنج آہنگ غالب (مرتبہ وزیر الحسن عابدی)		اُردو، کراچی، جنوری مارچ ١٩٧٠ء
٣٧۔ غالب کا اثر ہمارے ادب اور ادیبوں پر	١۔	ماہِ نو، کراچی، فروری ١٩٧٠ء

	۲۔ کتاب سے پہلے، غالب شاعر امروز و فردا، لاہور، ۱۹۷۰ء
	۳۔ ماہِ نو، جنوری فروری ۱۹۹۸ء
۳۸۔ پروفیسر حمید احمد خاں اور غالب	۱۔ افکار، کراچی، شمارہ ۵۰، سال ۱۹۷۰ء
	۲۔ ادبیات و شخصیات، لاہور، ۱۹۹۳ء
۳۹۔ اشاریۂ غالب (سید معین الرحمٰن)	نگار، کراچی، مئی جون ۱۹۷۰ء
۴۰۔ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ (حمید احمد خان)	نگار، کراچی، مئی جون ۱۹۷۰ء
۴۱۔ غالب کون؟ (سید قدرت نقوی)	نگار، کراچی، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء
۴۲۔ نقوش، غالب نمبر۲ (محمد طفیل)	نگار، کراچی، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء
۴۳۔ غالب، نو دریافت بیاض کی روشنی میں	۱۔ نقوش، غالب نمبر۳، ۱۹۷۱ء
	۲۔ نیا اور پرانا ادب، کراچی ۱۹۷۴ء
۴۴۔ ادبِ لطیف، غالب نمبر (ناصر زیدی)	نگار، کراچی، جولائی اگست ۱۹۷۱ء
۴۵۔ غالب اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)	نگار، کراچی، جنوری فروری ۱۹۷۵ء
۴۶۔ کیا دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ واقعی جعلی ہے؟	۱۔ غالب، کراچی، سالنامہ ۷۷-۱۹۷۶ء
	۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
	۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، ۱۹۹۵ء
۴۷۔ تحقیق غالب (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)	۱۔ فلیپ، مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۱ء
	۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس (تھیس) افصح وحید، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۱۴ اور ص ۲۱۷
۴۸۔ ''سوویت جائزہ'' (غالب کی مقبولیت)	۱۔ نگار، کراچی، ستمبر ۱۹۸۶ء
	۲۔ نگار، کراچی، فروری ۱۹۹۷ء
۴۹۔ غالب اور صادقین کی یاد میں	نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۷ء
۵۰۔ غالبیاتی مطالعاتِ نیاز:	۱۔ سالنامہ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۸۷ء
	۲۔ غالب فن و شخصیت (نیاز فتح پوری) مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۸۷ء

۵۱۔ غالب کے خطوط (ڈاکٹر خلیق انجم)	نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۸ء
۵۲۔ (غالب کے معاصر) بہادر شاہ ظفر (ڈاکٹر اسلم پرویز)	نگار، کراچی، اپریل ۱۹۸۸ء
۵۳۔ غالبیاتِ ظ۔ انصاری و شمس الرحمٰن فاروقی	نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۸ء
۵۴۔ (غالب دوست) مختار الدین احمد کی نذر	نگار، کراچی، فروری ۱۹۸۹ء

[۱۹۹۱ء–۱۹۹۸ء]

۵۵۔ ہم عصر سماجی و تہذیبی مسائل کا ادراک اور غالب	۱۔ سالنامہ صریر، کراچی، ۱۹۹۱ء
	۲۔ غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۲ء
	۳۔ نگار، کراچی، نومبر ۱۹۹۳ء
	۴۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
	۵۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
۵۶۔ غالب کی فارسی غزل (نیاز فتح پوری)	نگار، کراچی، جنوری ۱۹۹۲ء
۵۷۔ غالب اور تصوف (محمد مصطفےٰ صابری)	نگار، کراچی، جولائی ۱۹۹۲ء
۵۸۔ مشکلاتِ غالب (۱) (نیاز فتح پوری)	نگار، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۳ء
۵۹۔ مشکلاتِ غالب (۲) (نیاز فتح پوری)	نگار، کراچی، جنوری ۱۹۹۴ء
۶۰۔ کلامِ غالب میں لفظ "تمنا" کی تکرار بطور استعارہ فلسفہ آثار	۱۔ اوراق، خاص نمبر، لاہور ۱۹۹۳ء
	۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
	۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء
۶۱۔ غالب کی شاعری اور مسائلِ تصوف	۱۔ سالنامہ صریر، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۳ء
	۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
	۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
۶۲۔ غالب کے اثرات جدید اُردو شاعری پر	۱۔ سہ ماہی تمثیل، کراچی، جون ۱۹۹۳ء
	۲۔ نگار، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
	۳۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء
۶۳۔ غالب شکن (یگانہ/نجیب جمال)	نگار، کراچی، اپریل ۱۹۹۴ء

۶۴۔ نسخۂ حمیدیہ سے چند اشعار — تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، کراچی ۱۹۹۵ء

۶۵۔ شارحینِ غالب۔حسرت اور نیاز — نگار، کراچی، مئی ۱۹۹۵ء

۶۶۔ دیوانِ غالب کی ابتدائی پانچ غزلیں: تشریح و توضیح — فردا، مجلّہ، گورنمنٹ کالج مری، جون ۱۹۹۷ء

۶۷۔ غالب کی دو غزلوں کی شرح — تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء

۶۸۔ شرح دیوانِ غالب: کیوں اور کیسے؟ — تحقیق نامہ، شمارہ ۶، لاہور، ۱۹۹۸ء

مآخذ

غالب سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی نگارشات کے اس اشاریے کی ترتیب و تیاری میں مجھے درج ذیل مآخذ سے مدد ملی ہے۔

کتابیں

۱۔ ادبیات و شخصیات، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۹۳ء

۲۔ اُردو رباعی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۶۲ء

۳۔ تحقیق غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، کراچی، ۱۹۸۱ء

۴۔ تحقیق و تنقید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۶۳ء

۵۔ تمنا کا دوسرا قدم اور غالب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۹۵ء

۶۔ تنقید غالب کے سو سال، مرتبہ: فیاض محمود، اقبال حسین، لاہور، ۱۹۶۹ء

۷۔ غالب، ذاتی تاثرات کے آئینے میں، مرتبہ: شکور احسن، سجاد باقر رضوی، لاہور، ۱۹۶۹ء

۸۔ غالب، شاعر امروز و فردا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور، ۱۹۷۰ء

۹۔ غالب شناسائی اور نیاز و نگار، مرتبہ: ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور، ۱۹۹۸ء

۱۰۔ غالب فن و شخصیت، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۸۷ء

۱۱۔ نقوشِ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۹۵ء

۱۲۔ نیا اور پرانا ادب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، ۱۹۷۴ء

رسائل وجرائد

(۱) ادیب، علی گڑھ، جنوری جون ۱۹۹۲ء

(۲) اُردو، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء جنوری مارچ ۱۹۷۰ء

(۳) افکار، کراچی، شمارہ ۵۰، ۱۹۷۰ء

(۴) افکارِ نو، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء

(۵) العلم، کراچی، جنوری جون ۱۹۶۹ء

(۶) اوراق، لاہور، خاص نمبر، ۱۹۹۳ء

(۷) تحقیق نامہ، لاہور، شمارہ ۳-۴، سال ۹۵-۱۹۹۴ء شمارہ ۶، سال ۱۹۹۸ء

(۸) تمثیل، کراچی، جون ۱۹۹۳ء

(۹) راوی، لاہور، اپریل ۱۹۶۹ء

(۱۰) ساقی، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء

(۱۱) سورج، لاہور، اپریل مئی ۱۹۹۶ء

(۱۲) سیپ، کراچی، شمارہ ۸، سال ۱۹۶۶ء

(۱۳) شاعر، بمبئی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(۱۴) صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء۔

(۱۵) صریر، کراچی، سالنامہ ۱۹۹۱ء، جون جولائی ۱۹۹۳ء

(۱۶) غالب، کراچی، سالنامہ، ۷۷-۱۹۷۶ء

(۱۷) غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۲ء

(۱۸) فردا، مری، جون ۱۹۹۷ء

(۱۹) فروغِ اُردو، لکھنؤ، غالب نمبر ۱۹۶۸ء

(۲۰) قومی زبان، کراچی، مارچ ۱۹۶۹ء فروری ۱۹۸۱ء

(۲۱) ماہِ نو، کراچی، لاہور: جنوری فروری ۱۹۶۹ء فروری ۱۹۷۰ء
جنوری فروری ۱۹۹۸ء

(۲۲) محمل، کوپر روڈ لاہور، ۱۹۷۲ء

(۲۳) نقوش، لاہور: غالب نمبر ۱، ۱۹۶۹ء، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء

(۲۴) نگار، لکھنؤ: مئی ۱۹۵۲ء، جولائی ۱۹۵۴ء، دسمبر ۱۹۵۵ء، مئی ۱۹۵۶ء، مارچ ۱۹۵۷ء
اکتوبر ۱۹۵۷ء، نومبر ۱۹۶۱ء، جنوری ۱۹۶۲ء

(۲۵) نگار، کراچی: جولائی اگست ۱۹۶۵ء، جنوری ۱۹۶۶ء، اکتوبر ۱۹۶۶ء، نومبر ۱۹۶۶ء،
مارچ ۱۹۶۷ء، ستمبر ۱۹۶۷ء، مارچ ۱۹۶۸ء، جنوری فروری ۱۹۶۹ء،
مئی ۱۹۶۹ء، جون ۱۹۶۹ء، اگست ۱۹۶۹ء، ستمبر ۱۹۶۹ء، اکتوبر ۱۹۶۹ء
مئی جون ۱۹۷۰ء، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۰ء، جولائی اگست ۱۹۷۱ء،
جنوری فروری ۱۹۷۵ء، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء، اگست ۱۹۸۶ء
ستمبر ۱۹۸۶ء، فوری ۱۹۸۷ء، نومبر ۱۹۸۷ء، فروری ۱۹۸۸ء
اپریل ۱۹۸۸ء، اکتوبر ۱۹۸۸ء، فوری ۱۹۸۹ء، جنوری ۱۹۹۲ء،

جولائی ۱۹۹۲ء، نومبر ۱۹۹۳ء، اکتوبر ۱۹۹۳ء، جنوری ۱۹۹۴ء،
اپریل ۱۹۹۴ء، مارچ ۱۹۹۵ء، مئی ۱۹۹۵ء، فروری ۱۹۹۷ء

(۲۶) ہماری زبان، دہلی: مارچ ۱۹۶۷ء، نومبر ۱۹۶۸ء، دسمبر ۱۹۶۸ء

(۲۷) ہمدرد صحت، کراچی: جون ۱۹۶۹ء

(۲۸) ہندوستانی ادب، حیدرآباد دکن: جنوری مارچ ۱۹۶۹ء

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے احوال اور اُن کی مجموعی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں درج ذیل مطبوعات و مقالات کو دیکھنا مفید ہوگا)

پانچ مطبوعات:

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، شخصیت اور ادبی خدمات، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم، طبع اوّل دہلی، ۱۹۹۱ء طبع دوم کراچی، ۱۹۹۳ء

(۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد اوّل، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اوّل کراچی، فروری ۱۹۹۴ء

(۳) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد دوم، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اوّل کراچی، فروری ۱۹۹۴ء

(۴) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، حیات و خدمات، جلد سوم، مرتبہ: امراؤ طارق، طبع اوّل کراچی، نومبر ۱۹۹۴ء

(۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری، احوال و آثار، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، طبع اوّل، لاہور، ۱۹۹۸ء

پانچ غیر مطبوعہ تھیس:

(۱) ''نگار پاکستان'' کی ادبی خدمات ۱۹۶۲ء تا ۱۹۹۲ء، مقالہ نگار: محمد نذیر علوی، نگرانِ کار: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مقالہ: ایم فل (اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

(۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت نقاد، مقالہ نگار: محمد نذیر انور علوی، نگرانِ کار: ڈاکٹر نجیب جمال، مقالہ ایم اے (اُردو)، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۷ء

(۳) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بحیثیت محقق، مقالہ نگار: نورین فردوس، نگران کار: ڈاکٹر محمد احسان الحق، شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۹۰ء

(۴) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور اقبال شناس، مقالہ نگار: محمد سہیل سرور، نگرانِ کار: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۹۶ء

(۵) ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس، مقالہ نگار: سیدہ افصح وحید، نگرانِ کار: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، مقالہ برائے ایم اے (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۶ء

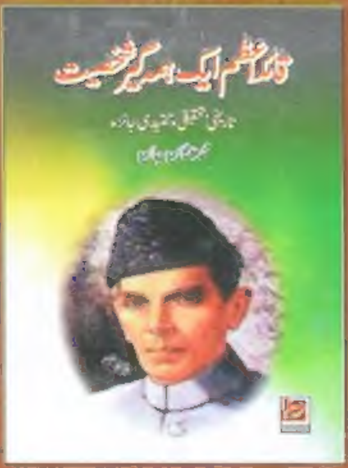

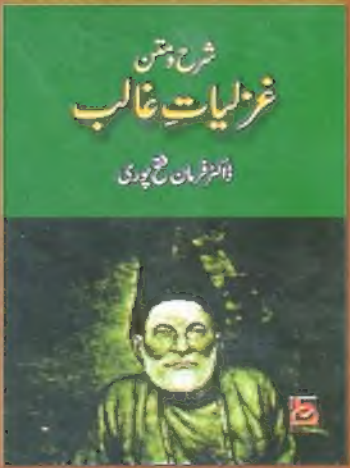

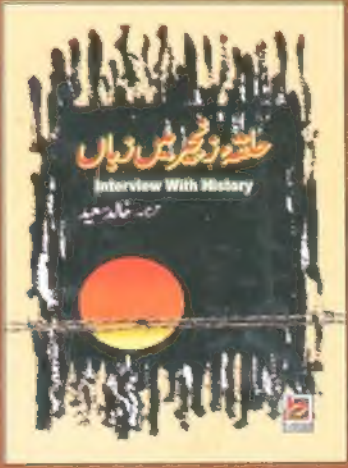

بیکن بکس

• غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-7351662
• گلگشت، ملتان فون: 061-6520790,6520791
E-mail:beaconbookspakistan@hotmail.com
E-mail:beacon_books_pakistan@yahoo.com

BEACON BOOKS

Rs.125

Design By